الرسالہ

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI 6

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

اسلام کی دعوت کیا ہے، آخرت کی چیتاونی۔ یہ قبر کے اُس پار کے معاملات سے قبر کے اِس پار والوں کو باخبر کرنا ہے۔ اسلام کا داعی موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوتا ہے، اس کو موت سے پہلے مرجانا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ دوسری طرف کی دنیا کو دیکھے اور مُردوں کے احوال سے زندوں کو مطلع کر سکے۔

شمارہ ١١
اکتوبر ١٩٧٧

زر تعاون سالانہ ٢٤ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ١٥ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

دعا یا کرتب

ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرے تو اس کا نام درخواست ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے کھڑا ہو جائے اور یہ یقین کرے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی، تو یہ کرتب ہے۔ درخواست دینا ایک بالکل معقول بات ہے۔ مگر کرتب اتنی ہی بے معنی چیز ہے۔

اسی طرح خدا سے مانگنے میں بھی ایک دعا کا طریقہ ہے اور دوسرا کرتب کا طریقہ۔ دعا یہ ہے کہ آدمی اپنے حاجات و مسائل میں خدا کی طرف رجوع کرے، اس سے روئے گڑگڑائے، اس سے حاجت روائی کی درخواست کرے۔ یہ عین مطلوب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی خدا سے مانگو۔

مگر کچھ لوگوں نے اسی کے ساتھ کرتب کے کچھ طریقے نکال رکھے ہیں —— فلاں لفظ اتنی بار دہرادو تو بلا ٹل جائے گی، فلاں وقت میں فلاں عمل کرلو تو حاجات پوری ہو جائیں گی۔ فلاں نقش کاغذ پر لکھ کر اتنے دن تک باندھے رہو تو دشمن ختم ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کرتب ہیں۔

دعا (اللہ کو پکارنا) جتنا با معنی ہے، کرتب (عملیات) کے طریقے اتنے ہی بے معنی ہیں۔ پہلا عین اسلامی ہے اور دوسرا قطعاً غیر اسلامی۔

فہرست

اداریہ

دور جدید کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں نے جو نقصان اٹھایا ہے، ان میں سے ایک نقصان اردو زبان کا ابھی تک بے ٹائپ ہونا ہے۔ دنیا کی تمام قابل ذکر زبانوں کے ٹائپ بن چکے ہیں۔ حتیٰ کہ خود ایران، جس سے ہم نے "فارسی رسم الخط" کو لیا ہے، اس نے بھی اپنے خط کو ٹائپ کی صورت میں ڈھال لیا۔ مگر برصغیر ہند کے مسلمان اپنی آفاقی فتوحات میں اتنے مشغول رہے کہ ان کو زمین پر کوئی تعمیری کام کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

ٹائپ صنعتی دور کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ٹائپ کا مطلب ایک آرٹسٹ کے عمل کو کروروں سے ضرب دینا ہے۔ مگر مسلمان دستکاری دور سے اوپر اٹھ کر سوچ نہ سکے۔ قدیم ترین زمانہ سے کتابت ایک شخصی فن کی حیثیت سے معروف چلا آرہا تھا۔ کتابت یا خوش نویسی کا مطلب یہ تھا کہ ایک آدمی برسہا برس کی محنت سے لکھنے کی مہارت حاصل کرے اور اس مہارت کو اپنی انگلیوں کے ذریعہ کاغذ پر منتقل کرے۔ مگر صنعتی علم نے بتایا کہ فن کار کے دستی عمل کو دھات کے ٹائپ کی شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایک فن کار کے عمل کے کروروں نقش تیار ہو جائیں گے اور جو قلم ایک وقت میں صرف ایک حرف لکھ سکتا تھا، وہ مشینی ضرب پاکر کروروں حروف بنا ڈالے گا۔

مگر مسلمان، دوسرے ملی امور کی طرح فن کتابت میں بھی، بدستور "دستکاری" ذہن سے سوچتے رہے اس سے باہر آکر جدید حقائق کا اندازہ نہ کر سکے۔ وہ جدید زمانہ میں قدیم دور کے کمالات دکھاتے رہے جس وقت ہم اپنے خوش نویسوں کو "آفتاب رقم" اور "اعجاز خطاطی" کے خطابات دے رہے تھے، ٹھیک اسی وقت بقیہ دنیا اپنے خوش نویسوں سے حروف کے نمونے لکھوا کر ان کو ٹائپ کی صورت میں ڈھال رہی تھی۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف خوش نویسی کے عمل کو دائمی طور پر محفوظ کر لیا بلکہ اپنے کو اس قابل بنا لیا کہ ایک خوش نویس کا قلم بیک وقت بے شمار کتابوں کی "کتابت" انجام دے سکے۔ ہم خوش نویسوں کی وصلیوں کی نمائش میں لگے رہے، جب کہ دوسری قوموں نے اپنے خوش نویسوں کے فن کو مستقل حیثیت سے محفوظ کر لیا۔

ہماری تمنا ہے کہ اگر حالات موافقت کریں تو ہم اردو زبان میں عربی ٹائپ کا رواج شروع کر دیں جس طرح ایران نے عربی ٹائپ کو اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔ اس کے لئے اپنا مکمل پریس قائم کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ بازار میں ایسے عربی پریس موجود نہیں ہیں جن سے کام کرایا جاسکے۔ خدا جلد وہ دن لائے جب کہ الرسالہ ٹائپ میں چھپنا شروع ہو جائے اور اسی کے ساتھ اس کا عربی ایڈیشن بھی۔

عربی ٹائپ کو اردو میں اختیار کرنے کی بات ہوتی ہے تو اکثر لوگ فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ ٹائپ کے ذریعہ چھپائی مہنگی پڑے گی۔ موجودہ حالت میں یہ بات صحیح ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت اردو میں ٹائپ کی عمومی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر کثرت سے اردو کے ٹائپ پریس قائم ہو جائیں تو ٹائپ کی چھپائی یقینی طور پر سستی اور آسان ہو جائے گی۔

رواج عام کے بعد وہی چیز بالکل معمولی بن جاتی ہے جو ابتداءً انہیں نہایت مشکل دکھائی دیتی تھی۔

شیشم کے بیج سے شیشم کا تناور درخت تیار ہوتا ہے،

اگرچہ سو سال بعد۔ اس کے برعکس ککڑی کے بیج سے وقتی بیل ہی اُگے گی،

خواہ ہزار برس تک اس کا بیج زمین میں بکھیرا جاتا رہے،

منفی تدبیروں سے کبھی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا

۱۹۴۵ کی ایک شام تھی۔ میں شہر میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں سڑک پر مسلمانوں کا ایک جلوس ظاہر ہوا۔ مقرر لاؤڈ اسپیکر پر بولتا: "پاکستان کا مطلب کیا"۔ مجمع متحدہ آواز سے جواب دیتا: "لا الٰہ الا اللہ"۔ یہ سیاست اپنے تمام خوش نما نعروں کے ساتھ ۳۰ برس پہلے ختم ہو گئی۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے رہنما آج بھی اسی فکری سطح پر ہیں جہاں ان کے پیش رو نصف صدی قبل تھے۔ آج بھی وہ ایک مفروضہ دشمن کے ختم کرنے کو اسلام کے احیاء کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ آج بھی بدلے ہوئے الفاظ کے ساتھ وہی نعرہ لگ رہا ہے: پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔

۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کے مسلمان سیاسی آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔ مذہبی رہنماؤں سے لے کر سیکولر لیڈروں تک ہر ایک یہ یقین کئے ہوئے تھا کہ سارا مسئلہ اکثریتی فرقہ کے سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کرنے کا ہے۔ جغرافی تقسیم اس مسئلہ کو حل کر دے گی۔ اور اس کے بعد اسلام اپنی ماضی کی تمام عظمتوں کے ساتھ زندہ ہو جائے گا۔

مگر اسلام کو دوبارہ زندہ کرنا ایک نئی تاریخ کو وجود میں لانا تھا۔ اور اس طرح کے جذباتی ہنگاموں اور سطحی خوش فہمیوں سے کبھی تاریخیں نہیں بنتیں۔ منفی کوششوں سے مثبت نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ بے حساب قربانیوں کے ذریعہ وجود میں آنے والا پاکستان اس امید کو پورا نہ کر سکا۔

اب ہمارے رہنماؤں نے ایک اور نام تلاش کر لیا جس کو مملکت خداداد میں اسلامی سپنوں کے پورا نہ ہونے کا ذمہ دار ٹھیرایا جا سکے۔ یہ مسلم لیگ تھی جس کو پاکستان بننے کے بعد وہاں کا اقتدار مل گیا تھا۔ اسلام کی راہ میں اس دوسری رکاوٹ کو دور کرنے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ پہلے اکثریتی فرقہ کو اقتدار کے مقام سے ہٹانا لا الٰہ الا اللہ کو ظہور میں لانے کے ہم معنی تھا۔ اب مسلم لیگی اقتدار کا خاتمہ اور اسلام کا احیاء دونوں ہم معنی قرار پا گئے۔ لمبی اکھیڑ پچھاڑ کے بعد یہ نشانہ بھی پورا ہوا۔ اور ۱۹۵۸ میں مسلم لیگی اقتدار ہمیشہ کے لئے پاکستان سے ختم ہو گیا۔ مگر اس کے بعد کرسی پر جس کو جگہ ملی وہ فیلڈ مارشل ایوب خاں تھے۔

اسلام کے احیاء کا خواب اب بھی بے تعبیر تھا۔ تاہم اسلام اور مایوسی دونوں یک جا نہیں ہو سکتے تھے۔ بہت جلد دریافت کر لیا گیا کہ اسلام کے قیام کی راہ میں

اصل رکاوٹ فیلڈ مارشل ایوب خاں کا اقتدار ہے۔
اس کو اگر کسی طرح ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد جو چیز برآمد ہوگی، وہ یقینی طور پر اسلام ہوگا۔ اب اسلامی جہاد کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اگرچہ اس مقدس جہاد میں خود ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ تاہم نشانہ پورا ہوا، اور ایوب خاں کو کرسی چھوڑنی پڑی۔ مگر اب بھی نفی سے اثبات برآمد نہیں ہوا۔ ۱۹۷۱ میں اس مقدس جہاد کا آخری سیاسی نتیجہ نکلا تو لوگوں نے حیرت انگیز طور پر دیکھا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

تاہم مجاہدین اسلام ہمت ہارنے والے نہ تھے۔ انھوں نے آواز لگائی: ایک کوشش اور کرو اور بھٹو کو اقتدار سے ہٹا دو۔ اس کے بعد اسلام کے سوا کسی کے لئے اس ملک میں جگہ نہ ہوگی۔ اب چوتھا اسلامی جہاد شروع ہوگیا۔ مگر ۷ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن سے جو فیصلہ برآمد ہوا، اس نے دوبارہ مسٹر بھٹو کے سر پر سیاسی تاج کو برقرار رکھا۔

اب معاملہ ناقابل برداشت تھا۔ مجاہدین اسلام کے لئے ممکن نہ رہا کہ وہ اگلے انتخاب کی رسمی مدت کا انتظار کریں۔ انھوں نے فوراً ہی براہ راست نعرہ لگا دیا: "بھٹو تخت چھوڑو"، سارے ملک میں آگ لگا دی گئی۔ اربوں روپے کے نقصانات کی قیمت ادا کرنے کے بعد بالآخر ۵ جولائی ۱۹۷۷ کے سورج نے یہ خبر دی کہ اسلام دشمن بھٹو کو تخت سلطنت سے معزول کر دیا گیا ہے تاہم اصل مسئلہ اب بھی بدستور قائم تھا "مولانا اسلام" کی جگہ "مسٹر جنرل" نے پاکستان کے اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لیا تھا۔

اب تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے مجاہدین اسلام خوشیاں منا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کا اسلامی قافلہ، اپنی پانچویں چھلانگ کے بعد، بالآخر منزل کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ "۱۸ اکتوبر" کا طلسماتی لفظ اب ان کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس تاریخ کو جس انتخاب کے انعقاد کا اعلان جنرل ضیاء الحق کی طرف سے کیا گیا ہے، وہ ان کے نزدیک پاکستان میں اسلام کی تاج پوشی کی محض ایک رسمی کارروائی ہوگی۔ اس قسم کے سیاسی معجزہ سے کون مسلمان خوش نہیں ہوگا۔ مگر راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ اس مسرت میں شریک ہونے کے لئے خوش فہمیوں کی جو بھاری مقدار مطلوب ہے، بدقسمتی سے وہ مجھ کو حاصل نہیں۔

وحید الدین ۔ ۸ ستمبر ۱۹۷۷

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے۔ امید ہے کہ آپ نے الرسالہ کو اپنے لئے مفید پایا ہوگا۔ اور آئندہ بھی آپ اس کا مطالعہ پسند فرمائیں گے۔

براہ کرم سالانہ زرتعاون بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ آپ کے نام جاری رکھا جا سکے۔

مینجر

جب مادی حالات کے اندر بھی روحانی دعائیں نکلنے لگیں

حضرت موسیٰؑ پر قتل کا الزام عائد کر کے جب مصری سرداروں نے مشورہ کیا کہ انھیں ہلاک کر دیں، تو آنجناب مصر سے مدین چلے گئے۔ مدین اس زمانہ میں، خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع علاقہ کو کہا جاتا تھا جہاں بنی مدیان آباد تھے۔ یہ مقام فرعونِ مصر کی سلطنت سے باہر تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ جب آپ خوف اور اندیشہ کی حالت میں سفر کر رہے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا:

عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (قصص-۲۲) امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا۔

بعض مفسرینِ قرآن نے اس کو محض راستہ کی تلاش کے معنی میں لیا ہے۔ ایک مفسر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں"

یہ الفاظ اس کیفیت کی ترجمانی کے لئے بہت ناقص ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں پیدا ہوئی تھی، یہ ایک مومنانہ کلمہ ہے نہ کہ عام معنوں میں محض ایک راستہ کے مسافر کی دعا۔ حضرت موسیٰؑ کو اگرچہ مادی حالات نے مصر سے نکال کر مدین کے راستہ پر ڈالا تھا، مگر بندہ مومن کا یہ حال ہوتا ہے کہ مادی واقعات کے اندر بھی اس کی زبان سے روحانی دعائیں نکلتی ہیں۔ بظاہر وہ اسی زمین میں راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے مگر زمین میں راستہ کی تلاش اس کے لئے دوسری دنیا کی یاد دہانی بن جاتی ہے، وہ اس کے ذہن کو آخرت کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے قدم دنیوی منزل کی طرف چل رہے ہوتے ہیں، مگر اس کے اندر کا طوفان پکار رہا ہوتا ہے ——— "خدایا! مجھے وہاں پہنچا دے جہاں میں تجھ کو پا سکوں۔ کیوں کہ انسان کی حقیقی منزل وہی ہے۔"

حضرت موسیٰؑ کا یہ کلمہ ایک نازک ایمانی کیفیت کا کلمہ ہے۔ اس کو سفر اور جغرافیہ کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ حقیقی معنوں میں اپنے رب کو پا لیں، ان کے جینے کی سطح بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ آج کی لذتوں اور تلخیوں کو دیکھتے ہوئے کل کے جنت اور جہنم کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالتِ غیب میں رہتے ہوئے حالتِ شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ عالمِ آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ اس وقت ہو گا جب کہ غیب و شہود کا فرق مٹ چکا ہو گا۔ جب قیامت کی چنگھاڑ سارے پردوں کو پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہو گا نہ کہ ایمان و یقین کا ثبوت دینے کا۔

پیغمبر اسلام نے جب حق کو بے آمیز شکل میں پیش کیا تو آپ کے معاصرین کو محسوس ہوا کہ آپ ان کے بزرگوں کی تحقیر کر رہے ہیں۔ ان کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ قبیلۂ قریش کا ایک معمولی آدمی ایسی سچائی کا جاننے والا ہو سکتا ہے جو ان شخصیتوں کو حاصل نہیں ہوئی جن کو اپنے روایتی اعتقاد کے مطابق وہ اونچا مذہبی مقام دیئے ہوئے تھے۔

عمرو بن مرۃ الجہنی رضی اللہ عنہ نے مدنی دور میں اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلہ جہینہ میں واپس آئے اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ابن عساکر کی روایت کے مطابق اس کے بعد قبیلہ کا ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا:

یا عمرو بن مرۃ! امر اللہ عیشک، اتامرنا برفض آلھتنا وان نفرق جمعنا وان نخالف دین آبائنا الشیم العلی۔ الی مایدعونا الیہ ھذ القرشی من اھل تہامۃ؟ لاحبا ولا کرامۃ، ثم انشأ:

ان ابن مرۃ قد اتی بمقالۃ — لیست مقالۃ من یرید صلاحا
انی لاحسب قولہ وفعالہ — یوما وان طال الزمان ذباحا
لیسفہ الاشیاخ ممن قد مضی — من رام ذلک لا اصاب فلاحا

اے عمرو بن مرۃ! خدا تیری زندگی تلخ کر دے، کیا تو ہم کو ہمارے معبودوں کو چھوڑنے کا حکم دے رہا ہے۔ اور یہ کہ ہم اپنی جمعیت کو منتشر کر دیں اور اپنے باپ دادا کے دین کی مخالفت کریں جو اعلیٰ اخلاق پر تھے۔ یہ تہامہ کا رہنے والا قریشی ہمیں کس چیز کی طرف بلاتا ہے، اس میں نہ کوئی شرافت ہے نہ کرامت ———

پھر اس نے یہ اشعار پڑھے:۔

عمرو بن مرۃ ایک ایسی بات لے کر آیا ہے جو صلاح پسند لوگوں جیسی بات نہیں۔ میرا یقین ہے کہ اس کا قول و فعل ایک دن مہلک ثابت ہو گا خواہ اس میں کچھ دیر لگ جائے۔ وہ ہمارے گزرے ہوئے اسلاف کو احمق ثابت کرنا چاہتا ہے اور جس کا ایسا ارادہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

شریعت کے نفاذ کا نیا رجحان

Islamic World Enforces Shariat To Fight Crime & Uphold Morality

الجزائر کے مشہور عالم اور مفکر مالک بن نبی (۱۹۰۵ - ۱۹۷۳) کی تمام تصنیفات فرانسیسی زبان میں ہیں کیوں کہ وہ اپنی مادری زبان (عربی) میں عمدہ اظہار خیال پر قادر نہ تھے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں مسلم ممالک پر مغربی قوموں کے غلبہ نے کس طرح حالات کو بدل ڈالا تھا۔ سترھویں صدی میں پرتگالی عالم اسلام کے ساحلی علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ہالینڈ نے جزائر شرق الہند پر غلبہ حاصل کر لیا۔ انیسویں صدی تک تقریباً تمام اسلامی دنیا مغربی قوموں کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں عثمانی خلافت کے سقوط کے بعد یہ عمل اپنی آخری انتہا کو پہنچ گیا۔

عالم اسلام پر مغرب کا یہ غلبہ ایک ہمہ گیر غلبہ تھا جس نے زبان، تہذیب، طرز معیشت ہر چیز کو بدلنا شروع کر دیا۔ اس کی زد قانون پر بھی پڑی۔ ہندستان میں ۱۷۹۱ تک چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ مگر انگریزوں نے اولاً متوازی عدالتیں قائم کیں اور بالآخر انیسویں صدی کے وسط تک تمام سابق قوانین کو بدل دیا گیا۔ صرف نکاح و طلاق جیسے معاملات شخصی قانون کی حیثیت سے باقی رہ گئے۔ اسی طرح مصر میں ابتداءً "المحاکم المختلطۃ" قائم کی گئیں۔ ۱۸۸۲ میں جب انگریز مصر کے اوپر قابض ہوئے تو بہت جلد انھوں نے شخصی احوال کو چھوڑ کر تمام امور میں مغربی قانون کو رائج کر دیا۔ یہی صورت کم و بیش دوسرے مسلم ممالک میں پیش آئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔ تاہم صورت حال میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ مغرب کا اقتصادی غلبہ شدید تر شکل میں مسلم ملکوں کے اوپر موجود تھا، جو اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر، اسلامی شریعت کے احیاء میں مانع تھا۔

پچھلے دس برسوں میں صورت حال میں غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ پٹرول کی قدرتی دولت نے اکثر مسلم ملکوں کو اس حد تک مالا مال کر دیا ہے کہ اب انھیں کسی کے چشم و ابرو کی طرف دیکھنے ضرورت باقی نہیں۔ بلکہ خود مغربی دنیا اپنی ادائگیوں کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے مسلم ملکوں کی محتاج ہو گئی ہے۔ اس صورت حال نے مسلم اقوام میں خود اعتمادی کا نیا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وہ دباؤ اور مرعوبیت کے دور سے نکل کر نئے بھروسہ کے ساتھ اپنے مذہب اور تہذیب کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ اس نئی صورت حال کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے حامیوں میں نیا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اکثر ملکوں میں اسلامی قانون کو دوبارہ زندہ کرنے کے چرچے ہو رہے ہیں۔ اسلامی قانون کے نفاذ کی خبریں عالمی اخبارات کی سرخیوں میں جگہ پانے لگی ہیں۔ ایک امریکی میگزین (ٹائم) نے سعودی عرب کی ایک تصویر چھاپی ہے جس میں چوری کے جرم میں ایک شخص کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہے۔ قطع ید کے قرآنی حکم کو

نقل کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

THIS STERN INJUNCTION WAS ENUNCIATED BY THE PROPHET MOHAMMAD SOME 1,300 YEARS AGO TO HIS FOLLOWERS IN A PRIMITIVE DESERT SOCIETY. NOW AFTER CENTURIES OF BEING SUPERCEDED BY WESTERN LAW THE EXACTING CODE OF THE KORAN IS ONCE MORE GAINING STRENGTH AND SUPPORT IN A NUMBER OF COUNTRIES.

Time, July 25, 1977

یہ سخت حکم پیغمبر اسلام نے ۱۳ سو سال پہلے اپنے پیروؤں کے سامنے ایک ابتدائی صحرائی سماج میں پیش کیا تھا۔ اب، صدیوں تک مغربی قانون سے دبے رہنے کے بعد، قرآن کا قانون دوبارہ مختلف اسلامی ملکوں میں زور پکڑ رہا ہے۔

اسی طرح رائٹر نے ایک خبر نشر کرتے ہوئے کہا ہے:

A TREND IS GROWING IN THE ISLAMIC WORLD TOWARDS TIGHTENING MORALITY AND DISCOURAGING CRIME BY THE REINFORCEMENT OF THE SHARIAT FORMULATED 1,400 YEARS AGO.

Times of India, August 15, 1977

اسلامی ملکوں میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ ۱۴ سو سالہ شریعت کے قانون کو نافذ کر کے جرائم کا خاتمہ کیا جائے اور اخلاقی فضا پیدا کی جائے۔

شرق اوسط کی پانچ عرب ریاستوں۔ سعودی عرب، قطر، عمان، لیبیا، شمالی یمن ۔ کے قانون کی بنیاد قرآن پر ہے۔ مصر، جہاں مغربی تہذیب کا غلبہ ہے، وہاں بھی ایک پارلیمنٹری کمیشن اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اسلام کی بنیاد پر ایک نیا قانون مرتب کرے۔ اس کے مطابق، دوسرے جرائم کے ساتھ، ارتداد کی سزا قتل ہوگی۔ الاہرام نے خبر دی ہے کہ عنقریب مصر میں قطع ید کی سزا نافذ ہو جائے گی۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے بھی اپنے ملک میں متعدد شرعی قوانین نافذ کئے ہیں جس میں ہاتھ کاٹنا اور سرعام کوڑے مارنا کی سزا بھی شامل ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے کہا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے لئے سن کرنے والی دوائیں استعمال ہوں گی۔ ٹائم لکھتا ہے:

THE THREAT WAS APPARENTLY SUFFICIENT TO CAUSE A SHARP DROP IN CRIME

اس قسم کی سزاؤں کا اندیشہ بظاہر جرائم میں زبردست کمی کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔

پاکستان کی طرح کویت اور عرب امارات متحدہ میں بھی قانون اسلامی کا نفاذ کیا جا رہا ہے۔ کویت نے سور کے گوشت کی تجارت بالکل بند کر دی ہے۔ یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ کویت یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ سعودی عرب میں نماز کے وقت دکان دار اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر مسجدیں نماز ادا کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی شخص دکان کی کوئی چیز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی قیمت بہت مہنگی ہے ۔ اپنے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے محرومی ۔ سعودی عرب میں جرائم کی شرح سب سے کم ہے ۔

کتے کی خصلت

کتا جب کسی کو نہتا دیکھتا ہے تو بھونکتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے تو دم دبا کر بھاگ جاتا ہے ۔

موجودہ مسیحی مذہب

اکثر مذاہب میں یہ غلطی ہوئی ہے کہ بعد کے دور میں وہ ان علوم کے ہم معنی بن کر رہ گئے جو ان کے بعد کے بزرگوں نے وضع کئے تھے۔ مثال کے طور پر موجودہ یہودیت اپنی بعد کی پیدا شدہ فقہ کا نام ہے اور مسیحیت بعد کے پیدا شدہ علم کلام کا۔

نئے عہد نامہ میں چار انجیلیں ہیں جن میں حضرت مسیح کے اقوال و احوال درج ہیں۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان کی صحت مشکوک ہے۔ تاہم موجودہ مسیحیت ان انجیلوں سے زیادہ سینٹ پال کے وضع کردہ نظریات پر مبنی ہے۔ ایک محقق نے لکھا ہے:

IN THE EFFECTIVE SENSE PAUL, RATHER JESUS, WAS THE FOUNDER OF CHRISTIANITY

Rationalist Encyclopedia, Page 437

زیادہ صحیح معنی میں، سینٹ پال نہ کہ حضرت عیسٰی، مسیحی مذہب کے بانی ہیں

اسپینوزا نے کہا تھا: "اس دنیا میں صرف ایک مسیحی تھا اور وہ صلیب پر چڑھا دیا گیا۔" جب ایک خالی الذہن آدمی نیا عہد نامہ پڑھتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر اس بیان کی تصدیق پاتا ہے نئے عہد نامہ کے ابتدائی چار ابواب جو حضرت مسیح کے حالات و اقوال کا ریکارڈ ہیں، ان میں کہیں بھی ان عقاید کا کوئی ذکر نہیں جن کے مجموعہ کا نام نیقیا کونسل (۳۲۵) کے اعلان کے مطابق مسیحیت ہے۔ کفارہ کا عقیدہ جو گویا کل مسیحیت ہے اس کو پہلی بار سینٹ پال نے وضع کیا جس نے حضرت مسیح کو دیکھا بھی نہ تھا۔ تثلیث خود سینٹ پال کے یہاں بھی نہیں وہ ترتولین (۱۵۰-۲۳۰) کی ایجاد ہے۔ اسی طرح دوسرے عقائد۔ اس کے بعد صرف حضرت مسیح کے بارہ ساتھی یا شاگرد رہ جاتے ہیں جن کو سچا مسیحی کہا جا سکے۔ مگر خود کتاب مقدس کے مطابق جب رومی سپاہیوں نے حضرت مسیح کو پکڑا تو "سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے"۔ (مرقس، ۱۴: ۵۰)

انجیل یا نیا عہد نامہ باعتبار ترتیب ۲۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ مگر "انجیل مقدس" کا لفظ حقیقتہً صرف ابتدائی چار کتابوں پر صادق آتا ہے جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی مرتب کی ہوئی ہیں اور جن میں حضرت مسیح کے حالات و اقوال درج ہیں۔ دوسری ۲۳ کتابیں بعد کے مسیحی بزرگوں کے خطوط یا ان کے مکاشفات و احوال پر مبنی ہیں۔

کتاب مقدس کا ایک طالب علم سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ مجلد کتاب جو "انجیل مقدس" کے نام سے آج اس کے ہاتھوں میں ہے وہ کب اور کس زبان میں لکھی گئی۔ مگر اس کی کوئی تاریخ قطعیت کے ساتھ بتائی نہیں جا سکتی۔

قدرت کا سبق

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لئے جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

معلومات نہیں، ذہنی رجحان

نوبل پرائز کا حصول، سائنس کی دنیا میں، اعلیٰ ترین کارکردگی کا ایک مسلمہ معیار سمجھا جاتا ہے۔ یہ انعام کیسے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ایچ۔ اے۔ کریبز (H.A. KREBS) نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اعلیٰ سائنس داں بننے کے لئے اعلیٰ سازوسامان والی لیبارٹریوں اور جدید ترین لٹریچر پر مشتمل لائبریریوں سے بھی کہیں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کچھ مدت کے لئے کسی بڑی سائنسی شخصیت کی صحبت و رفاقت میسر آجائے۔ "اگر مجھے اپنی جوانی کے ابتدائی چار سال" وہ لکھتا ہے "آٹو واربرگ (OTTO WARBURG) جیسے سائنس داں کی رفاقت میسر نہ آتی تو میرے اندر سائنس کا صحیح ذوق پیدا ہونا محال تھا۔"

کریبز مختلف بڑے بڑے سائنس دانوں کے اقوال پیش کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اعلیٰ سائنس دانوں کی صحبت جو بڑی چیز کسی کو دیتی ہے وہ سائنسی حقائق اور سائنسی طریقوں کے بارے میں معلومات کا انبار نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو ہر جگہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جو بات حقیقی فرق پیدا کرتی ہے، وہ دراصل فیضانِ نظر ہے جسے استاد اپنے شاگرد میں منتقل کرتا ہے۔ یہی فیضانِ نظر، جس کو وہ عمومی سائنسی روح (GENERAL SCIENTIFIC SPIRIT) کا نام دیتا ہے، کسی شخص کو سچا سکالر بناتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک عظیم استاد یا سائنس داں اپنے شاگرد کے ذہن میں حقائق کے بارے میں معلومات سے کہیں زیادہ ایک ذہنی رویہ (ATTITUDE) منتقل کرتا ہے۔۔۔ اس ذہنی رویہ میں دو باتیں بالخصوص بہت اہم ہیں۔ ایک، عجز (HUMILITY) دوسرا شوق (ENTHUSIASM) (اگریکلچرل سائنس ریویو)

نمک خواہ ایک ٹن ہو، کوئی چیونٹی اس کے پاس نہیں آئے گی۔ لیکن شکر ایک گرام بھی ہو تو چیونٹیوں کی فوج اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قوموں کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ کوئی قوم "شکر" پسند ہو تو آپ اس کو "نمک" کے گرد اکھٹا نہیں کر سکتے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ "قوالی" پسند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی ایسی ہی چیز انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے جس کے ساتھ قوالی کی چاشنی لگی ہوئی ہو — مذہبی قوالی، سیاسی قوالی یا اور کوئی قوالی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے گلے باز لوگوں کے گرد بہت تیزی سے جمع ہو جاتے ہیں جو خطابت کے دریا بہاتے ہوں، جو اشعار اور قصے سنائیں، جو فضائل اور کرامت کی داستانیں بیان کریں۔ کسی سنجیدہ آواز اور کسی تعمیری دعوت کے گرد وہ کبھی اکھٹا نہیں ہوتے۔

گراوٹ کے اسی مرحلہ کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے: ان کا حال یہ ہے کہ سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اس کو اختیار نہ کریں اور ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں۔ (اعراف ۔ ۱۴۶)

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسا ہیبت ناک دن ان کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں اور ان کے پاس بولنے کے لئے الفاظ نہ رہیں

اس آئینہ میں آپ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں

خدا کے وفادار بندوں کے مشیر فرشتے ہوتے ہیں اور خدا کے باغیوں کے مشیر شیطان۔ جو آدمی اختلاف کے وقت تواضع اختیار کرے، وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو یہ توفیق ملی ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے مشیر بنیں۔ کیونکہ فرشتوں کی صفت یہ ہے کہ وہ استکبار نہیں کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ اختلاف کے وقت ظلم اور ناانصافی پر اتر آئیں اور متکبرانہ روش اختیار کریں، وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے شیطان کو اپنا مشیر بنا رکھا ہے۔ کیونکہ قرآن میں گھمنڈ اور سرکشی کو صرف شیطان کی صفت بتایا گیا ہے

خدا — انسانی فطرت کی آواز ہے

فرانس کی ایک فلم ایکٹرس گائنا لولو برایگیڈا (GINA LOLLOBRIGIDA) جنوری ۱۹۷۵ میں ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال و جواب یہ تھا:

TO A QUESTION WHETHER SHE BELIEVED IN GOD, GINA SAID: I BELIEVE IN GOD. I BELIEVE IN GOD, MORE WHEN I AM ON AN AEROPLANE.

Times of India, 3.1.1975

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، گائنا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔

آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تا کہ وہ تمھیں اپنی قدرتیں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا ہے جو بدعہد اور ناشکرا ہے۔" (لقمان ۳۱-۳۲)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

۲۔ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۸۷۹-۱۹۵۳) خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (۱۸۷۴-۱۹۶۵) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۴۲ میں ماسکو کا سفر کیا تا کہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لیے روسی لیڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلہ میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا جس کا خفیہ نام ٹارچ (TORCH) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبہ میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبہ کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں اس کی زبان سے نکلا:

MAY GOD PROSPER THIS UNDERTAKING

خدا اس منصوبہ کو کامیاب کرے۔

Winston S. Churchill,
The Second World War (Abridgement)
Cassell & Company
London, 1965, P. 603

۳۔ سابق صدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے افراد خاندان جب آخری فوٹوگراف کے لئے وائٹ ہاؤس میں جمع ہوئے تو سرکاری فوٹوگرافر کو ان کا فوٹو لینے میں کافی دیر لگی۔ کیونکہ صدر نکسن سمیت سب لوگ رو رہے

تھے اور فوٹو گرافر اس انتظار میں تھا کہ بغیر آنسوؤں کا کوئی لمحہ ملے تو شاٹ لے سکے۔

واٹر گیٹ سکینڈل کے متعلق ٹیپ ریکارڈنگ جس نے نکسن کی صدارت کو ختم کیا، اگر نکسن چاہتے تو اس کو ضائع کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی صدارت خطرہ میں نہ پڑتی۔ مگر صدر نکسن کو یہ لالچ تھا کہ صدارت کے بعد اس ٹیپ کو فروخت کر کے وہ معقول رقم حاصل کر سکتے ہیں، مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ٹیپ ریکارڈنگ لوگوں کے علم میں آگئی اور نکسن کی صدارت ایسے بھونچال کا شکار ہوئی کہ علیحدگی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

واٹر گیٹ اسکینڈل کے انکشاف سے پہلے رچرڈ نکسن اتنا زیادہ پریشان تھے کہ نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ وائٹ ہاؤس میں روتے رہتے۔ انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگرچہ سخت نگرانی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آخری ایام THE FINAL DAYS نامی کتاب میں انکشاف کیا گیا ہے کہ:

AS THE END NEARED, NIXON ASKED SECRETARY OF STATE HENRY KISSINGER TO KNEEL AND PRAY WITH HIM, SAYING:
"YOU ARE NOT A VERY ORTHODOX JEW AND I AM NOT AN ORTHODOX QUACKER, BUT WE NEED TO PRAY."

Daily American (Rome) 27.3.1976

جب صدارت کا خاتمہ قریب آگیا، نکسن نے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں اور دونوں مل کر دعا کریں۔ "نہ تم زیادہ پکے یہودی ہو نہ میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں"، نکسن نے کہا اور عیسائی طریق عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے۔

۴۔ روس میں اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس طرح اس انقلاب پر اب پورے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ کروڑ سوویت شہریوں میں ۲۱ کروڑ ایسے لوگ ہیں جو اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے سماج میں جس میں، حکومت روس کے دعوے کے مطابق، قدیم مذہبی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اشتراکی نظریہ کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمہ کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پروان چڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جو ۱۹۷۳ میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی جہاز (ILYUSHIN JET) ہندستان میں مغربی بنگال کی فضا پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا ہوا بازی کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور جہاز زمین پر گر پڑا۔ ہوا باز سمیت سارے مسافر جل کر ختم ہو گئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سرزمین پر ہوا تھا اس لئے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خودکار مشین رکھی جاتی ہے جس کو عام طور پر (BLACK BOX) کہتے ہیں۔ یہ

بلیک باکس ہوا باز اور کنٹرول ٹاور کے درمیان گفتگو کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دُم میں رکھا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہاز کے جلنے کے بعد بھی وہ بچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے ملبہ سے اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا ٹیپ بجایا گیا تاکہ اس سے تفتیش میں مدد لی جاسکے تو معلوم ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی ہوا باز کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا:

PETER SAVE US

(سینٹ پیٹر ہم کو بچا) واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے اور عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

۵۔ کون جانتا تھا کہ سٹالن کی اپنی لڑکی سویتلانہ SVETLANA ALLILUYEVA اس کے بعد عیسائی مذہب قبول کرے گی۔ سویتلانہ اشتراکی دنیا سے مایوس ہو کر ہندستان آئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ہندستانی مذہب میں پناہ لے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے لئے اس کا یہاں رہنا ہند۔ روس دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ یورپ چلی گئی، اور وہاں عیسائیت کو اختیار کر لیا۔

سویتلانہ اپنی کتاب ONLY ONE YEAR (صرف ایک سال) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو ہی میں غیر مطمئن تھی اور اپنے قلب کی تسکین کے لئے کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی ــ وہ چیز مجھے بائبل کے ان جملوں میں مل گئی:

خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے مجھے کس کی دہشت۔
خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس کی ہیبت۔

خواہ میرے خلاف لشکر خیمہ زن ہو۔
میرا دل نہیں ڈرے گا۔
خواہ میرے مقابلہ پر جنگ برپا ہو۔
تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔

زبور: ۲۷

۶۔ آج کے روس میں اس کیفیت کے ابھرنے کے شواہد کثرت سے مل رہے ہیں۔ سولژے نتسین اور سخاروف اسی روحانی کش مکش کی ایک علامت ہیں۔ سولژے نتسین کو اگر نوبل انعام حاصل کرنے کی اجازت ملی ہوتی تو وہ اس رقم کو روسی عوام کے لئے ایک گرجا تعمیر کرنے میں صرف کرتا۔ سولژے نتسین کے ایک مغربی دوست ویلتری پلینی سے پوچھا گیا کہ روسی سلطنت کا سب سے کمزور پہلو کیا ہے۔ اس نے بلاتردد جواب دیا:

THE HUNGER OF ORDINARY PEOPLE
FOR MORAL AND SPIRITUAL TRUTH

"عام انسان کی یہ بھوک کہ وہ اخلاقی اور روحانی سچائی کو پا سکے"۔

جو شخص گھمنڈ اور عصبیت جیسی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو وہ کبھی سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی ہی کھلی شکل میں اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔ سچائی کو پانے کے لئے سچائی کا طالب ہونا ضروری ہے۔

ناموافق حالات زندہ قوموں کیلئے

ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں

آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹-۱۹۷۵) چند خوش قسمت مصنفین میں سے ہے جس نے اپنی زندگی ہی میں عالمی مقام حاصل کرلیا۔ اس انگریز مورخ کو سب سے زیادہ شہرت اپنی ۱۰ جلدوں پر مشتمل "اسٹڈی آف ہسٹری" کی وجہ سے ملی جس میں اس نے ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ وہ قوتیں جو تاریخ بناتی ہیں، وہ بنیادی طور پر داخلی قوتیں ہیں نہ کہ خارجی اسباب۔ اس نے قدیم زمانہ سے لے کر اب تک تمام بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کرکے دکھایا ہے کہ ان تہذیبوں کو جن قوموں نے پیدا کیا، وہ تخلیقی صلاحیت رکھنے والی اقلیتیں تھیں جنھوں نے وقت کے چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دیا۔

اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ وہ اکثریت کی طرف سے مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں۔ یہ دباؤ عملی زندگی میں بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے کسی قوم کی وہ اندرونی تخلیقی صلاحیت ابھرتی ہے جو اُس کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ پیش آنے والے چیلنج کے مقابلہ میں قائدانہ رول ادا کرسکے۔ اس کے برعکس جن قوموں کی لغت میں "دباؤ" کے معنی صرف "مظلومیت" کے ہوتے ہیں، ان کے حصہ میں فریاد و احتجاج کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنی محرومیوں کا رجسٹر بنانے میں مشغول رہتی ہیں یا جلسوں اور تقریروں کا کمال دکھا کر سمجھتی ہیں کہ انھوں نے اپنی سربلندی کا راز پالیا ہے۔ یہاں تک کہ جب وقت کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے اس دنیا میں قبرستان کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کا مطلوب انسان

ایک حدیث ہے کہ —— اَلْمُومِنُ مِرْاٰۃُ الْمُومِنِ —— یعنی مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ آج کی صحبت میں آپ کے لیے میں یہی بننا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر بہترین خدمت جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ میں نہایت سادہ اور مختصر طور پر چند ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھوں جس میں آپ خود کو بالکل برہنہ دیکھ سکیں۔ اللہ میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

ایمان کی علامت کیا ہے۔ اس کی اگر مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو شاید وہ دو چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ قرآن اور نماز —— یہ دو الفاظ دراصل پورے دین کا عنوان ہیں۔ ایک نظری حیثیت سے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور دوسرا عملی پہلو سے۔ اسی نے دراصل خدا کو پایا ہے جس نے قرآن اور نماز کو پایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اگر آپ کی زندگی میں شامل ہوگئی ہوں تو سمجھیے کہ ایمان اور اسلام آپ کی زندگی میں شامل ہوگیا ہے اور اگر آپ کی زندگی ان سے خالی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ابھی تک ایمان اور اسلام سے محروم ہیں۔

ان دونوں چیزوں کی بنیادی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، جیسا کہ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتَابِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ ○ (اعراف - ۱۷۰)

جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوط پکڑ لیتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، ہم ایسے مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔

گویا مصلح صرف وہ ہے جو قرآن اور نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر چکا ہو۔ ایسے ہی لوگوں کی کوششیں خدا کی نظر میں "اصلاح" کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے عمل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں برومند کرے گا اور آخرت میں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا۔ دوسرے مقام پر یہی چیز حکم کے انداز میں کہی گئی ہے:

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ (عنکبوت - ۴۵)

کتاب الٰہی کا جو حصہ تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اس کو پڑھو اور نماز قائم کرو۔

مگر قرآن اور نماز کو پانے کا مطلب کسی لفظی مجموعے یا کسی ظاہری ڈھانچے کو پالینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک عظیم حقیقت کو پانا ہے جو آدمی کے وجود پر چھا جاتی ہے، جو اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر چیز جو آپ کی زندگی میں نظر آرہی ہو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو آپ نے حقیقی طور پر اختیار کیا ہو —— دوسرے یہ کہ وہ آپ کی زندگی کا حقیقی جزء نہ ہو بلکہ کچھ دوسرے اسباب کے تحت وہ آپ کے اثاث البیت میں شامل ہوگئی ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی الفاظ کے ذریعے اپنے بارے میں جو دعوے کر رہا ہو اس کا "لحن القول" اس کے خلاف گواہی دے رہا ہو (محمد - ۳۰) اس کی زبان وقلم سے نہایت اعلیٰ درجے کی باتیں ٹپک رہی ہوں مگر اس کا یہ تمام عمل یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران - ۱۶۷) کا مصداق ہو۔ اس کی زندگی کا مرکز ومحور اس کے معاشی مفادات، اس کی بیوی بچے اور اس کی دنیوی تمنائیں ہوں مگر گفتگو اور تعلقات

میں وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرے گویا اس نے خدا اور اس کے دین کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص امت کی حالت زار پر تقریریں اور بیانات شائع کر رہا ہو مگر اس کی زندگی میں ایک رات بھی ایسی نہ گزری ہو جب کہ امت کے درد میں اس کی نیند اڑ جائے اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس کی زبان سے نکلے کہ —— "خدایا تو انھیں ہدایت دے، خدایا مجھے طاقت دے کہ میں ان کو تیرے راستے کی طرف بلا سکوں" تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امت کے درد سے زیادہ اس کو خود اپنا درد ستا رہا ہے۔ کیونکہ اس عنوان کو اختیار کیے بغیر وہ پریس اور اسٹیج سے اپنے آپ کو نمایاں نہیں کر سکتا۔ میز کے گرد بات چیت میں اگر کوئی شخص مظلوم انسانوں کی حمایت پر گرما گرم حصہ لے رہا ہو مگر اس کی روزمرہ کی زندگی مظلوم انسانوں کی ہمدردی سے خالی ہو تو یہ ہمدردی کا نہیں بلکہ ریاکاری کا ثبوت ہے۔ رسمی قسم کے بحث و مباحثہ میں اگر کوئی شخص اصول اور ضابطے کا بہت حوالہ دیتا ہو، مگر اس گفتگو کے باہر جو زندگی وہ گزارتا ہے وہ بے اصولی کا نمونہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ حقیقتاً اس کے اندر موجود نہیں ہے اس کو وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہے وہ اپنے کو ایک ایسی حیثیت میں ظاہر کر رہا ہے جو کہ دراصل اس کی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہے مگر خود اس کو عمل کے جو مواقع حاصل ہیں ان میں وہ خود بھی اسی قسم کی کمزوریاں ظاہر کر رہا ہے جس میں دوسرے لوگ اپنے دائرے کے اندر مبتلا ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو فی الواقع اصلاح حال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کو صرف تنقید عزیز ہے اور اسی کو وہ انجام دے رہا ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ ٹراونکور کے علاقے میں ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر کچھ عیسائی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: "مسلمانوں کے اندر مذہبی اسپرٹ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا ہر بچہ جب تعلیم شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔" بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں تو یہ روایت رہی ہے کہ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سب سے پہلے کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سطحیت پسندی نے اس ذوق کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کی صبح تو اب تلاوتِ قرآن کے بجائے تلاوتِ اخبار میں بسر ہونے لگی ہے۔ تاہم اب بھی ہمارے یہاں ایسے مردوں اور عورتوں کی کافی تعداد ہے جو کسی نہ کسی حد تک اس روایت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس قسم کی تلاوت بھی ایک دینی کام ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ محض الفاظِ قرآنی کی تلاوت نہیں بلکہ "تلاوتِ حق" ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:-

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ط أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ (البقرہ - ۱۲۱)

جو لوگ کتاب الٰہی کے حامل ہیں وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی اس کے حقیقی مومن ہیں۔

یہ تلاوت حق جس کو حاصل ہو گئی ہو وہی دراصل قرآن کا قاری ہے اور وہی اس پر صحیح معنوں میں ایمان لانے والا ہے۔ تلاوتِ حق کی پہچان کیا ہے۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے یہ آیت آتی ہے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ اَیُّکُمْ زَادَتْہُ ھٰذِہٖٓ اِیْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (توبہ۔۱۲۴)

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو بعض (منافقین) کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا ہے۔ ہاں اس نے ان لوگوں کا ایمان بڑھا دیا ہے جو واقعی مومن ہیں اور وہ اس کو پاکر خوش ہیں۔

اس آیت سے قرآن پر ایمان رکھنے والوں کی پہچان یہ معلوم ہوئی کہ وہ جب قرآن کو پڑھیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو، وہ اپنے بہترین احساسات کو اس کے اندر بولتا ہوا پائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر عرفانِ حق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:-

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۔ (مائدہ۔۸۳)

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو خدا کے رسول پر اترا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑتے ہیں عرفانِ حق کے سبب سے۔

اضافۂ ایمان اور عرفانِ حق دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ جو لوگ قرآن کے واقعی مومن ہیں وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو یہ کتاب انھیں سراپا حقیقت نظر آتی ہے، وہ حقیقت جس کے متعلق علم انسانی نے تسلیم کیا ہے کہ وہ کبھی اسے معلوم نہیں کر سکتا۔ وہ حقیقت جس کو فلسفہ ہزاروں سال سے تلاش کر رہا ہے مگر وہ اس تک پہنچ نہ سکا، اہل ایمان اس کو خدا کی کتاب میں پالیتے ہیں۔ قرآن کی شکل میں وہ حقیقت کو دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ علم ان کے یقین کو بڑھاتا ہے، قرآن کے مضامین اپنے پڑھنے والے سے جس قسم کی جوابی کیفیات کا تقاضا کرتے ہیں ان کا دل ہر مقام پر بالکل اس کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ جب زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کر کے اللہ تعالےٰ پوچھتا ہے کہ ان کا خالق کون ہے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے "بل انت یا رب"۔ جب خدا کے احکام بیان ہوتے ہیں اور انسان سے اس کی حیثیت کے مطابق صحیح رویے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے دل کے اندر یہ یقین ابھرنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے، جس مطالعہ سے یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ اندھے بہرے کا مطالعہ ہے۔ (فرقان) مومن جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اس طرح پڑھتا ہے گویا وہ رب العالمین کی آواز سن رہا ہے، گویا وہ خدا سے ہم کلام ہے، گویا قرآن خود اس کے اوپر نازل ہو رہا ہے۔ قرآن اس کی سب سے محبوب کتاب بن جاتی ہے جس میں وہ اپنے جذبات کی تسکین پاتا ہے، جس سے وہ اپنے دل کی دنیا کو آباد کرتا ہے، جس سے اس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے، جو اس کے تمام عقلی اور روحانی تقاضوں کا جواب بن جاتی ہے۔

قرآن کا یہ پانا محض ایک علمی دریافت کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا اپنے رب کو پانا بلکہ اس تک

پہنچ جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگوں کے علمی ذوق نے انھیں کتابوں کا عاشق بنا دیا۔ اسی طرح اس کی بھی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ کسی فلسفی یا مفکر کی تصنیفات نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بالکل اس کے مومن ہو گئے۔ مگر خدا کی کتاب کا معاملہ اس قسم کے واقعات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کائنات کے خالق و مالک کی کتاب ہے اور ہم اس کے حقیر بندے ہیں۔ اس نسبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ قرآن سے ہمارا تعلق محض علمی تعلق نہ ہو بلکہ وہ بندے اور خدا کا تعلق بن جائے۔ ہم جب قرآن کو پڑھیں تو ہمارے اوپر وہ ہیبت طاری ہو جو کائنات کے فرمانروا کا حکم سن کر اس کے ایک عاجز غلام پر طاری ہونی چاہیے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ہمارا دل پگھل جائے، ہماری آواز پست ہو جائے، ہمارا پورا وجود سراپا عجز و نیاز بن کر اس کے آگے جھک جائے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (زمر۔ ۲۳)

وہ اللہ ہے جس نے یہ بہترین کتاب اتاری ہے جس کی باتیں آپس میں ملتی ہوئی دہرائی ہوئی ہیں، اس کو سن کر ان لوگوں کے بدن کانپ اٹھتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے دل اور ان کے جسم خدا کی یاد کی طرف جھک جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن خدا سے ڈرنے والوں کے لیے کپکپی پیدا کر دینے والی کتاب ہے، اس کو سن کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ انھیں خدا کی طرف مائل کرتی ہے، وہ انھیں ذکر الٰہی میں غرق کر دیتی ہے، وہ جب اسے سنتے ہیں تو ان کے قلوب پگھل کر آنکھوں کے راستے سے بہنے لگتے ہیں۔ قرآن کو سنتے یا پڑھتے کے وقت دل کے اندر خدا کی یاد اور خشوع پیدا ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی "قسادتِ قلب" کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے۔ (حدید۔ ۱۶)

یاد رکھیے قرآن سے ناآشنا صرف وہ لوگ نہیں ہیں جن کے لیے یہ کتاب "کتابِ مہجور" بن گئی ہے، جنھوں نے قرآن کو اس طرح پس پشت ڈال دیا ہے گویا کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں، گویا ان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ شخص بھی قرآن سے محروم ہے جس کے لیے یہ کتاب صرف خوش الحانی کے لیے موزوں الفاظ مہیا کرتی ہو، جس کے لیے وہ محض علمی غور و بحث کا موضوع ہو، جس کے لیے وہ حوالے کی کتاب ہو جس کو وہ تحریر و تقریر کے وقت الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے ہزاروں انسانوں کے درمیان صرف قرآن کی بنیاد پر اپنی شخصیت کا سکہ بٹھا رکھا ہو، مگر وہ قرآن کی نعمت سے محروم ہو۔ اسی طرح اگر آدمی زبان و قلم کے ذریعے قرآن کے اسرار و معارف بیان کر رہا ہو مگر اس کی اپنی زندگی ان حقیقتوں سے خالی ہو تو یہ بھی خدا کی کتاب سے محرومی کی ایک قسم ہے۔ دوسروں کو کتاب الٰہی کا درس دینا اور خود "نسیان" میں مبتلا رہنا، قرآن سے تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا ثبوت ہے (بقرہ۔ ۴۴) اگر کسی نے لغت اور نحو کی مدد سے الفاظِ قرآن کو حل کر لیا ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن کو بھی پا گیا ہے۔ قرآن کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جس نے

اپنے سینے کی دھڑکنوں میں اس کو بولتے ہوئے سنا ہے، جس نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جن کا قرآن میں ذکر ہے جس نے اس کو اس طرح پڑھا ہے گویا وہ خود اپنے اندر چھپے ہوئے صحیفے کو زبان سے دہرا رہا ہے۔ یاد رکھیے حقیقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس نے اپنے دل کی کتاب پر اس کو لکھا ہوا پایا ہے۔ جس نے صرف لفظی تشریحات کے ذریعہ اسے جانا ہے، اس نے حقیقت کو ابھی تک پایا ہی نہیں:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ (عنکبوت - ۴۹)

قرآن کیا ہے وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں۔ جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں، جو معرفت رکھتے ہیں۔

قرآن کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں، وہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ صفتیں بتاتی ہیں کہ قرآن کے وہ کیا کیا پہلو ہیں جن کا ہماری زندگیوں میں شامل ہو جانا ہمارا خدا کی کتاب کو پالینا ہے۔ قرآن کو پانے والا وہ ہے جس کی مردہ روح کو قرآن سے زندگی ملی ہو، جس کے لیے وہ دل کے زنگ کو دور کرنے والی کتاب ہو، جس کے لیے وہ نور بن گیا ہو جس کی روشنی میں وہ چلتا ہو۔ قرآن کو ان لوگوں نے پایا ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ اسے پڑھتے ہیں تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں اور وہ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت صاحب قرآن کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو بتاتی ہیں کہ آدمی کو قرآن کی تلاوت حق نصیب ہوئی ہے یا نہیں اور اس نے فی الواقع خدا کی کتاب کو پالیا ہے یا وہ ابھی تک اس سے محروم ہے:

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا۔ (مریم - ۵۸)

جب اللہ کی آیتیں انھیں سنائی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لیے فتنے میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ٹھیک یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (مدثر - ۳۱)

اسی طرح اللہ (قرآن کی آیتوں سے) کسی کو گمراہ کرتا ہے اور کسی کو ہدایت دیتا ہے۔

بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر آدمی کا اپنا چہرہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ آئینہ کے اندر صاف دکھائی دے گا۔ چنانچہ قرآن سے بھی آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہو۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جب کہ آدمی اس میں سے ایسی باتیں ڈھونڈلے جو اس کے لیے قرآن پر ایمان نہ لانے کا بہانہ بن جائیں۔ مگر جو لوگ قرآن کو مانتے ہیں وہ بھی اس خطرہ سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس قسم کی ممکن صورتوں میں سے ایک وہ ہے جس کا عنوان تحریف ہے۔ یعنی سب کچھ جاننے کے باوجود محض اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کلام الٰہی کے الفاظ یا اس کے معانی کو بدل دینا (بقرہ - ۷۵)

دوسری چیز اقتسام ہے (حجر۔ ۹۰) اقتسام کے معنی ہیں بانٹنا، تقسیم کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائی تعلیمات کو پوری کل میں قبول نہ کیا جائے بلکہ اپنی خواہش کے مطابق ٹکڑے کر کے اس کے بعض حصّوں کو لیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ تیسری چیز وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ کہا گیا ہے (توبہ۔ ۳۰) مضاہاۃ کے معنی عربی زبان میں مشاکلۃ الشیٔ بالشیٔ کے آتے ہیں (لسان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل باطل کے خیالات سے متاثر ہو کر یا دنیوی مصالح کی بنا پر ان کی بات کو اپنا لیا جائے اور اس کو اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ خدائی تعلیم کے عین مطابق یا اس کے مشابہ ہے۔

جہاں تک پہلی صورت (تحریف) کا تعلق ہے اس کی بنیاد مکمل طور پر بدنیتی کے اوپر قائم ہے۔ اور ہم سب لوگ اس کی برائی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مگر دوسری اور تیسری صورت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ فتنہ کبھی کبھی اچھے خاصے نیک نیت لوگوں میں بھی اس طرح چپکے سے داخل ہو جاتا ہے کہ انھیں خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنا کام تمام کر کے بالآخر انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اکثر حالات میں متاثر ذہن کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وقت کی سوسائٹی میں جن خیالات کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح حقیقی دنیا کی بہت سی مصلحتیں معصوم شکل میں آ کر اس کے ذہن کی سطح سے بار بار ٹکراتی رہتی ہیں۔ یہ چیزیں مل کر کبھی شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر اس کا ایک فکر بنا دیتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ چیزوں کو صرف اس حیثیت سے نہیں دیکھتا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو اس حیثیت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن لے کر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بلا ارادہ اقتسام کی ایک صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ قرآن کی بعض ایسی باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کی کتاب کو پا لیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ اس نے خدا کی کتاب کے بڑے حصّہ کو چھوڑ کر اس کے بعض اجزا کو اپنے خود ساختہ مفہوم میں لے لیا ہے۔ اس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائید میں اتفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آ گئیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس تعلیم یافتہ نوجوان کی ہے جو اپنی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورت ملازمت" کے اشتہارات دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ نوجوان اپنے اس مطالعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجنے کے لیے کچھ پتے حاصل کر لے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بے خبر رہے گا اور اخبار بینی کے اصل مقصد کو حاصل نہ کر سکے گا۔

اسی طرح مضاہاۃ کی خرابی بھی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ اس میں ماحول کے ذاتی تاثر کے علاوہ خاص طور پر تبلیغی ضروریات کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ جو بات لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی

ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کرسکیں۔ نیز یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو بہ پہلو جگہ لے سکے۔ یہ اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنادیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزوی مشابہت توضرور اس میں موجود رہتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف جو بعض محققین کے نزدیک یونانی لفظ تھیوسوفیا (THEOSOFIA) کی تعریب ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہوگیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصوّر ان کے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تصور کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے تقریباً دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہوگئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جب کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش روؤں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے صوفیائے کرام سے ہوچکی ہے۔ اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کرکے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو ایک جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے۔ اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدّر رہیں۔

؎ یہ یونانی زبان کے دو لفظوں کا مرکب ہے THEOS بمعنی خدا اور SOFIA بمعنی حکمت۔ انگریزی میں معمولی تغیر کے بعد یہ لفظ THEOSOPHY کی شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ "تھیوسوفی" اس عقیدے یا اصول کے لیے اصطلاحی لفظ کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہ ہر شخص بلا واسطہ خدا کی معرفت روحانی وجدان سے حاصل کرسکتا ہے۔

نماز

اب نماز کو لیجیے۔ نماز دین کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر کسی کا ایمان ہی معتبر نہیں۔ وہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ (حدیث) مگر یہ فائدہ صرف اس نماز سے حاصل ہوتا ہے جو صلوٰۃ خشوع ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ (مومنون - ۲) کامیاب ہوئے ایمان لانے والے، وہ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

میں یہاں چند چیزوں کا ذکر کروں گا جس سے معلوم ہوگا کہ صلوٰۃ خشوع کیا ہوتی ہے اور اس کی علامات کیا ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اس سے مراد وہ نماز ہے جو اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی اس کا نگراں اور محافظ بن گیا ہو:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ (بقرہ - ۲۳۸) اپنی نمازوں کی حفاظت کرو۔

یہاں حفاظت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روزانہ زندگی کو ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی نماز میں خلل ڈالنے والی ہو، جس سے وہ اپنی نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا نہ کر سکے۔ اس میں وقت کا اہتمام خاص طور پر داخل ہے۔ محافظتِ صلوٰۃ، اپنے ابھرے ہوئے مفہوم کے لحاظ سے، محافظت اوقات کا دوسرا نام ہے۔ نماز اہل ایمان کے لیے "کتاب موقوت" ہے جس کو متعین لمحات میں "رکوع کرنے والوں" کے ساتھ باجماعت ادا کرنا ہے۔ اس لیے آدمی کو ہر اس عادت یا ہر اس مشغولیت سے اپنی زندگی کو بچانا اور پاک کرنا ہے جو اس کو وقت پر نماز باجماعت کی ادائیگی سے محروم کر دے یا تکبیر تحریمہ کے وقت وہ مسجد کی صف میں کھڑا ہوا نظر نہ آئے۔

ٹھیک وقت پر نماز کے لیے حاضر ہونا محض فوجی ڈسپلن کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ دراصل بندے کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ ہے کہ وہ آقا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے گھر سے "آؤ نماز کی طرف" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو خدا کا بندہ ہر دوسری مشغولیت سے اپنے آپ کو فارغ کر کے خدا کی پکار کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ انتہائی آمادگی اور انتہائی تعلق کا ثبوت ہے۔ وقت آتے ہی نماز کے لیے دوڑ پڑنا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی میں اولین مقام صرف خدا کو دے رکھا ہے۔ مگر جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ گویا اس بات کا مظاہرہ کرتا ہے کہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو بھی وہ اپنی عبادت میں شریک کیے ہوئے ہے۔ وہ یا تو بے حسی کا شکار ہے یا کسی دوسری مشغولیت کو اس نے اپنی زندگی میں وہ مقام دے رکھا ہے جو دراصل خدا کا ہونا چاہیے۔

مسجدوں کی صف بندی دراصل خدا کے دربار میں کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ جو اس اہم ترین وقت پر خدا کے گھر میں نظر نہ آئے یا دیر سے پہنچے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو خدا کی پکار سے زیادہ اپنے نفس کی پکار عزیز ہے۔ عین اس وقت بھی وہ اپنے آپ کو دوسرے مشاغل میں مصروف رکھتا ہے جب خدا کے بندے خدا کے حضور کھڑے ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہے۔

ایک امام کا واقعہ ہے۔ ان کی مسجد کے نمازی عموماً دیر کر کے نماز کے لیے آتے تھے۔ ایک روز نماز شروع ہوئی تو حسب دستور پیچھے چند آدمی موجود تھے، اور جب امام نے سلام پھیرا تو پوری صف کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔ "کاش اللہ تعالےٰ مجھے متقیوں کا امام بنائے۔ ایسے لوگوں کی امامت نے تو مجھے بیمار بنا دیا جن کا حال یہ ہے کہ جب نماز شروع ہو چکی ہے یا اس کا ایک حصّہ گزر جاتا ہے تو وہ بھاگم بھاگ آتے ہیں اور دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بخدا یہ وہ نماز نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطلوب ہے۔ یہ کسل کے ساتھ خدا کی عبادت کے لیے اٹھنا ہے جس کو ذکر قلیل کہا گیا ہے یا وہ صلوٰۃ سہو ہے جس پر قرآن میں سخت وعید آئی ہے"

خاص طور پر صبح کی نماز جو "صلوٰۃ مشہود" ہے[1] (بنی اسرائیل - ۷۸) اس میں جو شخص وقت پر نہیں پہنچا یا اس سے غیر حاضر رہتا ہے وہ تو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا لباس اس سے اتار لیا جائے اور شیطان کے مقابلہ میں اس کے پاس کوئی پناہ باقی نہ رہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:-

مَنْ صَلَّى صَلوٰةَ الصُّبْحِ فَهُوَ فِي ذِمَّتِهِ اللّٰهِ فَلَا يَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْئٍ فَإِنَّهُ مَنْ يَطْلُبْهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْئٍ يُدْرِكْهُ ثُمَّ يَكُبَّهُ عَلٰى وَجْهِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ۔ (مسلم)

جس نے صبح کی نماز ادا کر لی وہ اللہ کے ذمہ میں آ گیا۔ پس ایسا نہ ہو کہ اللہ تم سے اپنے ذمہ کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔ کیونکہ اللہ جس سے اپنے ذمہ کے متعلق کسی چیز کے بارے میں سوال کرے گا وہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا

فجر کی نماز حدیث کے الفاظ میں "اول نہار" کی نماز ہے، وہ دوسری نمازوں کا مقدمہ ہے۔ ہر روز جب صبح کی سپیدی سورج کے آنے کی خبر دیتی ہے تو دو طرح کے مواقع انسان کے لیے کھلتے ہیں۔ ایک دنیا کا کام، دوسرا آخرت کا کام۔ عین اس وقت موذن بلند مقام پر کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے:-

حَيَّ عَلَى الصَّلوٰةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ — آؤ نماز کی طرف، آؤ کامیابی کی طرف۔

یہ پکار انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ دن کی سرگرمیوں کو شروع کرنے سے پہلے خدا کے گھر میں آئے اور فجر کی نماز ادا کر کے اپنے اس ارادے کا اظہار کرے کہ وہ آنے والے لمحات کو آخرت کی کامیابی حاصل کرنے میں لگائے گا، وہ آنے والے دن کو خدا کی عبادت میں بسر کرے گا۔ عین اس وقت ایک اور پکارنے والا پکارتا ہے۔ یہ انسان کا دشمن شیطان ہے جو ایک ایک شخص کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ وہ اپنے دن کو صرف دنیا حاصل کرنے میں لگائے۔

پہلی پکار دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہے۔ ہزاروں کی آبادی میں صرف چند ایسے لوگ مسجد کے لیے نکلتے ہیں جو بوڑھے ہو چکے ہیں یا کسی اور کام کے قابل نہیں رہے ہیں۔ مگر دوسری پکار کو سن کر ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، کسان اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑتے ہیں، تاجر کنجیوں کے بڑے بڑے گچھے لے کر اپنی دکانوں کی طرف

---

[1] صلوٰۃ مشہود کے معنی ہیں حضوری کی نماز، روبرو کی نماز۔

روانہ ہو جاتے ہیں۔ ملازم اپنے دفتروں کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جنھیں صرف آرام عزیز ہے وہ اس سہانے وقت میں اپنے نرم بستروں سے لپٹ جانے کو موزوں ترین خیال کرتے ہیں۔

کس قدر غافل ہے انسان جو اس وقت بھی محروم رہتا ہے جب کہ پانے کے امکانات سب سے زیادہ ہوں۔ ایک دروازہ جو ہر روز انسان کے لیے کھلتا ہے مگر نادان انسان ہر روز اسے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

صلوٰۃِ خشوع کی دوسری پہچان یہ ہے کہ نماز میں آدمی کا جھکنا اس کی پوری زندگی میں اسی قسم کے جھکاؤ کا عنوان بن جاتا ہے۔ اس کا رکوع اور سجدہ دراصل اس بات کا ایک عملی اقرار ہے کہ اس نے پوری زندگی خدا کے آگے ڈال دی ہے، وہ مکمل طور پر خدا کے حکم کا پابند بن چکا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت۔ ۴۵) نماز بدکاریوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

ایک نبی نے جب لوگوں کو خدا کا عبادت گزار بننے کی دعوت دی تو ان کی قوم، جس نے اپنی زندگی کی باگ اپنے نفس کے حوالے کر دی تھی اور کسی دوسرے نظام اطاعت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے جواب دیا:

یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ہود۔ ۸۷

اے شعیب! کیا تمہاری نماز کہتی ہے کہ ہم ان چیزوں کی عبادت چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں اور ہمارے مالوں میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز محض رسمی قسم کی پوجا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود اور تمام اثاثے کو خدا کے آگے ڈال دینے کا نام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا کے حضور جھک کر زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ "میرے آقا تو مجھے حکم دے، میں تیرے حکم کی تعمیل کروں گا۔" اس اقرار کے باوجود اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ اس کی مسجد کی نماز اس کی پوری زندگی کی نماز نہیں بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک صلوٰۃِ خشوع سے محروم ہے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق جس نماز کے ساتھ "اتباعِ شہوات" پایا جا رہا ہو، وہ ایسی نماز ہے جس سے روحِ صلوٰۃ ضائع ہو چکی ہے (مریم۔ ۵۹)

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی نمازیں بہت اچھی نہ سہی تاہم وہ نماز تو پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی بہر حال فرض کی ادائگی کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ صرف شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ ذکرِ قلیل نہیں، بلکہ ذکرِ کثیر ہے۔ ذکرِ قلیل کو تو منافقوں کی پہچان بتایا گیا ہے۔ (نسار۔ ۱۴۲)

صلوٰۃِ خشوع کی تیسری اور آخری پہچان یہ ہے کہ بندہ جب نماز میں مشغول ہو تو وہ اپنے آپ کو خدا سے بالکل قریب محسوس کرے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق ۱۹) سجدہ کر اور قریب ہو جا

یہ سجدۂ قربت کیا چیز ہے، اس کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب آدمی اس عالم میں پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک ان دیکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بعید ترین چیز سے

انتہائی طور پر قریب ہے، کسی مخاطب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین گفتگو میں مصروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ پرہیبت چیز کے لیے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پا رہا ہے۔ ایک چیز جس کو بظاہر کسی بھی واسطہ کے ذریعہ محسوس نہیں کیا جاسکتا، کسی واسطہ کے بغیر وہ اس تک پہنچ گیا ہے۔

گویا سجدہ جو نماز کی انتہائی حالت ہے، وہ بیک وقت خدا سے قریب ہونے کی بھی انتہائی حالت ہے۔ نماز کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے اس کی معیت اور قربت حاصل کرسکیں۔ نماز کے ذریعہ آدمی جب اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ روحانی طور پر خدا سے جڑ جاتا ہے۔ وہ یادِ الٰہی کی ایسی حالت اپنے اوپر طاری کرتا ہے جب کہ وہ مکمل طور پر ایک حیاتی وجود بن جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو خدا کے اندر گم کردیتا ہے۔ وحدت وجود کا تصور غالباً اپنی ابتدائی شکل میں محض اس کیفیت کو بتانے کے لیے تھا جو تصور الٰہی میں غرق ہونے کے وقت آدمی کے اوپر طاری ہوتی ہے۔ مگر بعد کو منطقی تعین کی کوشش نے اس کو ہمہ اوست کے ناقابل فہم فلسفے تک پہنچا دیا۔ اگر اس بدنام عقیدے کے متعلق میری تشریح کو صحیح مانا جائے اور اس کو محض حیاتی ارتباط کے مفہوم میں لیا جاسکے تو میں کہوں گا کہ سجدۂ قربت کے وقت آدمی پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے شاید انسانی زبان میں یہ ایک قریب ترین تعبیر ہے۔ جب سپردگی کا لمحہ آتا ہے، جب عجز اور محدودیت کا پیکر اپنے آپ کو لامحدود کمال کے حوالے کردیتا ہے، جب پیشانی اس طرح کھنچ اٹھتی ہے گویا وہ زمین سے چپک گئی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قطرہ نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا ہے، گویا انسان خدا سے جاملا ہے۔

خاتمہ

یہ تلاوتِ حق اور صلوٰۃ خشوع کی مختصر ترین تشریح ہے جو میں نے آپ کے سامنے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کچھ نئی باتیں نہیں ہیں۔ ہر وہ شخص جس نے قرآن کو پڑھا ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے آج آپ کے سامنے ان کو اس لیے دہرایا ہے تاکہ انھیں یاد دلا کر آپ سے یہ عہد لوں کہ آپ ان کو اپنی زندگیوں میں شامل کریں گے۔ آپ میں سے ہر شخص کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے اس معاہدہ پر بیعت کرتا ہے کہ وہ اپنے علم کو اپنا احساس بنائے گا۔ وہ جو کچھ جانتا ہے اس کو محسوس کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ سچ مچ یہ اقرار کریں تو یقین مانیے کہ یہ کائنات آپ کے لیے سلام و مرحبا کی آواز سے اس طرح گونج اٹھے گی کہ آپ کے کان اس کی آواز سنیں گے، اور آپ کے لیے خدا کی جنت کے دروازے اس طرح کھول دیے جائیں گے کہ آپ جیتے جی اس کی خوشبو محسوس کریں گے۔

اور اگر آپ اس عہد کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ سب کچھ جو اجالے میں ہے اور وہ سب کچھ جو اندھیرے میں چھپا ہوا ہے، گواہ ہے کہ خدا کے یہاں اب آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا یہ کہہ کر کہ آپ ان باتوں کو پہلے سے جانتے ہیں، آپ نے خود اپنے اوپر حجت تمام کردی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے کو نہیں بدلتے تو مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے پاس وہ کونسا سہارا ہے جس کے بل پر آپ رب العالمین کے سامنے اتنی بڑی جسارت کررہے ہیں۔ (زندگی ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند، بمقام بدایوں، ۱۶/ اپریل ۱۹۶۱ء

صنعتی نظام کا تضاد

ایرک گل (ERIC GILL) نے لکھا ہے:

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد اور استعمال کا سب سے بڑا مقصد انسانی محنت کی بچت ہے، لہٰذا ہمیں مشینوں کو نہیں، انسانوں کو ختم کرنا ہے مگر وہ انسان جسے ہم دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ وہ انسان ہے جو کارخانہ میں کام کرتا ہے نہ کہ محلّہ میں بسنے والا انسان۔ محلّوں رہنے والے انسان ہمارے ساتھی ہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح پیدائش میں انسانی محنت کے دخل کو ختم کیا جائے، اور دوسری طرف صارفین (CONSUMERS) کی تعداد اور ان کی قوت خرید کو بھی بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ جڑ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی ہے۔"

یہ صنعتی نظام کا وہ مسئلہ ہے جس کا کوئی حل اس کے موجودہ ڈھانچہ میں نہیں۔ قدیم زمانہ میں انسان اپنی محنت سے پیداوار تیار کرتا تھا اور انسان ہی اسے خریدتا تھا۔ اس طرح اقتصادی عمل کے اندر کوئی تضاد نہیں تھا۔ اب ٹکنالوجی کے دور میں مشین پیداوار تیار کرتی ہے۔ جب کہ اشیاء کو خریدنے والے اب بھی انسان ہی ہیں۔ اس صورت حال نے اقتصادی عمل کے درمیان تضاد پیدا کر دیا ہے۔ یعنی انسان اور پیداوار کے درمیان فاصلہ۔ جدید صنعتی نظام ایک طرف پیداوار کو پُر فخر طور پر بڑھاتا ہے، دوسری طرف خریداروں کو مسلسل گھٹا رہا ہے۔ مشین کی ترقی یہ ہے کہ وہ کام کرنے والوں کی تعداد کو انتہائی حد تک کم کر دے۔ مگر یہ بھاری مشینیں جو پیداوار نکالتی ہیں، ان کو کھپانے کے لئے دوبارہ بڑھتے ہوئے خریداروں کی ضرورت ہے۔ یہ خریدار کہاں سے آئیں جب کہ خود مشین ہی نے پورے اقتصادی عمل پر قبضہ کر کے ان کو بے روزگار کر دیا اور نتیجۃً ان کی قوت خرید کو ختم کر دیا۔

یہ ہے وہ تضاد جس سے آج کا صنعتی نظام دوچار ہے۔ اس کی جو کامیابی ہے، وہی اس کی ناکامی بن گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ بھاری مشینیں ایجاد کر کے کام کرنے والوں کی تعداد گھٹا دے۔ مگر کام کرنے والوں کی تعداد کو گھٹانا عملاً خریداروں کی تعداد کو گھٹا دینا ہے۔ اس طرح مشینی عمل کے معنی بالآخر یہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ٹکنکل کمالات سے جو قیمتی پیداوار تیار کرے، خود اس کے اپنے عمل کے نتیجہ میں اس کو بازار سے اٹھانے کے لئے خریدار موجود نہ ہوں۔

کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳) کی کتاب سرمایہ (DAS KAPITOL) کا پہلا ایڈیشن جرمن زبان میں چھپا تو اس کے فروخت ہونے میں اتنے سال لگ گئے کہ کہا جاتا ہے کہ اس کی آمدنی کارل مارکس کے سگار کا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اسی کارل مارکس کی کتابوں، اس کے ترجموں اور اس کی تشریحات پر آج اتنے بے شمار ادارے قائم ہیں جن سے لاکھوں لوگوں کو قیمتی روزگار مل رہا ہے۔

کام صرف وہ ہے جو خود اپنے مثبت فکر کے زور پر وجود میں آئے۔ خارجی حالات کے خلاف ردعمل کے طور پر جو چیز ظاہر ہو، وہ کام نہیں، جذباتی ابال ہے۔ اس قسم کا جذباتی ابال وقتی شور و شر تو ضرور پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس سے کسی حقیقی نتیجہ کی امید کرنا ایسا ہی ہے جیسے کتے کی بھونک سے بلبل کے نغمہ کی توقع کی جائے۔

نادانی کی چھلانگ

حکایت ہے کہ کسی زمانہ میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ ایک بندر اور ایک مچھلی اس میں پھنس گئے۔ بندر تیز تھا۔ چھلانگ لگا کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ پر جا بیٹھا جہاں وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ تھا۔ اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نے سمجھا کہ مچھلی طوفان میں پھنس گئی ہے۔ وہ پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ نیچے آیا اور مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔

نادان دوستی کی یہ تمثیل ایڈیسن کی زندگی میں واقعہ بن چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایڈیسن ایک کتا پالے ہوئے تھا جو اس کو بہت محبوب تھا۔ ایک روز ایڈیسن کا کتا اس کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر اس کے ضروری کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور کروسین کا لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پتنگا کہیں سے کمرے میں داخل ہو گیا اور لیمپ کے گرد منڈلانے لگا۔ کتا دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر اس کو گوارا نہ ہوا کہ اس کے آقا کی میز پر ایک پتنگا قابض ہو جائے۔ اس نے اس کو پکڑنے کے لئے ایک چھلانگ لگائی۔ پتنگا تو اڑ گیا، البتہ لیمپ الٹ گیا اور میز پر تیل پھیل جانے کی وجہ سے فوراً آگ لگ گئی اور کاغذات جل گئے۔ ایڈیسن نے دیکھا تو کہا:

"میرے محبوب کتے! تجھے نہیں معلوم کہ تو نے کیا کیا"۔

موجودہ زمانے میں ہمارے رہنماؤں نے بھی حیرت انگیز طور پر اسی قسم کے کارنامے دکھائے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اصلاح ملت اور احیائے اسلام کا نعرہ لے کر اٹھا۔ مگر ہر ایک نے ایسی نادانی کی چھلانگیں لگائیں کہ اصل مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جس کے نتیجہ میں مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ گمبھیر ہو گیا۔ نادانی کے اقدام سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔

تاریخ کو انتظار ہے

رابطۂ عالم اسلامی (مکہ) نے دو سو صفحات پر مشتمل ایک عربی کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے: لماذا اسلمنا (ہم نے اسلام کیوں قبول کیا) اس کتاب میں موجودہ زمانہ کے ۴۲ نومسلموں نے خود اپنے قلم سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ ان میں سے چند جاپانی ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت شدت اور یقین کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ علی محمد موری جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان جغرافی طور پر روس اور امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے اس لئے دونوں بلاک جاپانی قوم کے اندر اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں۔ کیوں کہ جاپان کے روحانی سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپانی نوجوانوں میں نئے آدرش کی تلاش کا جذبہ شدت سے ابھرا۔ اس موقع سے عیسائی مبلغین نے فائدہ اٹھایا اور جاپان کی نئی نسل میں عیسائیت پھیلنے لگی۔ مگر بہت جلد وہ اس سے متوحش ہو گئے۔ کیونکہ انھیں محسوس ہوا کہ عیسائی مشنریوں کے پیچھے برطانوی اور امریکی استعمار کے مقاصد کام کر رہے ہیں (۱۴۴)

عمر یتا جاپانی جنھوں نے جاپانی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ جاپان میں اسلام کے لئے ایک عظیم مستقبل ہے۔ جاپانی قوم سچے دین کی پیاسی ہے وہ کسی مذہبی تعصب میں بھی گرفتار نہیں۔ اس لئے اگر اس کے سامنے دین فطرت کو پیش کیا جائے تو وہ بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھے گی۔ انھوں نے دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے افراد کو جاپان بھیجیں جو اس قوم کو خدا کا سچا پیغام پہنچا سکیں۔ (۱۵۱)

محمد سلیمان تاکیوتشی جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان کے موجودہ حالات اسلام کی اشاعت کے لئے انتہائی موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان مادی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر روحانی مایوسی سے دوچار ہے۔ کیونکہ یہ ترقیاں اس کی روح کو تسکین نہ دے سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان میں مناسب انداز سے اسلام کی اشاعت کی جائے تو صرف دو تین نسلوں میں سارے ملک میں اسلام پھیل جائے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو یہ شرق اقصیٰ میں اسلام کی عظیم نصرت کے ہم معنی ہوگا اور بالآخر ساری نوع انسانی تک اس کے اثرات پہنچیں گے (۱۶۷)

ہر پیدا ہونے والا فطرت الٰہی پر پیدا ہوتا ہے۔ معبود کی طلب انسان کی پیدائشی ساخت میں اس طرح شامل ہے کہ اس کو کسی طرح اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس فطری طلب پر موجودہ زمانہ میں مزید یہ اضافہ ہوا ہے کہ مادی تہذیب سے مایوسی نے ساری دنیا میں ایک نئی تلاش کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ ان حالات نے آج دین حق کی اشاعت کے ایسے امکانات کھول دئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھے۔

اپریل ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں کانگریس کی شکست سے پہلے جو شخص وزیر اعظم کے بعد ملک کا دوسرا سب سے طاقت ور آدمی سمجھا جاتا تھا، وہ یہاں ہتھکڑی میں بندھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔



Mr Bansi Lal, former Defence Minister, at the city police station, Bhiwani, in handcuffs before he was taken to the district court on Wednesday.

سابق وزیر اعلیٰ ہریانہ اور سابق وزیر دفاع شری بنسی لال ۲۳ اگست ۱۹۷۷ کو ہریانہ میں گرفتار کرلئے گئے۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے ہریانہ یوتھ کانگریس فنڈ کا پانچ لاکھ روپیہ خورد برد کیا ہے۔

موت بھی اسی قسم کی ایک گرفتاری ہے۔ وہ تمام دوسری گرفتاریوں سے زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ زمین و آسمان کے مالک کی طرف سے اس کے بندوں کی گرفتاری ہے۔ گرفتاری کا یہ دن ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "بنسی لال" کی گرفتاری سے تو خوب واقف ہیں۔ مگر خود اپنی گرفتاری کی انھیں خبر نہیں۔ یہ خدائی گرفتاری کا دن اتنا ہولناک ہے کہ اگر آدمی کو اس کا واقعی احساس ہو جائے تو وہ ہر گرفتاری کو اپنی گرفتاری سمجھے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا خود اسی کو باندھا جا رہا ہے۔

قبرص میں ۱۹۷۴ میں فوجی انقلاب ہوا اور نکوس سیمپسن صدر ہو گئے۔ ان کی صدر ہو گئے۔ ان کی صدارت اس کے بعد دوبارہ انقلاب ہوا۔ نکوس سیمپسن کو صدارت کے عہدہ سے معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت نے ان کو ۲۰ سال قید کی سزا سنائی۔ تصویر میں ان کو ہتھکڑی پہنا کر جیل لے جایا جا رہا ہے۔



Nicos Sampson, who was President of Cyprus for a week in 1974, being taken from the courtroom in Nicosia in handcuffs to serve a 20-year jail sentence for his role in the military-coup that year. On the right is Mrs Sampson.

ایک شخص مقام اضطرار پر ہو تو صرف دعا کے کلمات ہی نصرت الٰہی کو کھینچنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر جو شخص یا گروہ مقام اضطرار پر نہ ہو بلکہ اس کو جدوجہد کے مواقع بھی حاصل ہوں، اس کے لئے دعا کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنی دعا کے موافق عمل کرے۔ (فاطر۔ ۱۰)

دعا کے موافق عمل کیا ہے، یہ اس دعا سے متعین ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں نصرت کو طلب کرنے کے لئے آدمی مانگ رہا ہو ——— اگر کوئی شخص قرآن کے اسرار وحکم جاننے کی دعا کر رہا ہو تو اس کے لئے اس دعا کے موافق عمل یہ ہوگا کہ وہ کتاب الٰہی میں تدبر کرے۔ کوئی شخص نصرتِ معاش کا طلب گار ہے تو اپنی دعا کے ساتھ اس کو معاش کی راہوں میں اپنی ممکن جدوجہد صرف کرنی ہوگی۔ اغیار کے خلاف نصرت رعب مطلوب ہے تو اپنے درمیان اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔ اعدائے اسلام پر نصرتِ فتح کی دعا کی جارہی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا جائے اور اس کو اتمام حجت کی حد تک لے جانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو پوری طرح آگاہ کرنے سے پہلے ہلاک نہیں کرتا۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ اہل اسلام اگر ۲۰ ہوں تو اہلِ باطل کے ۲۰۰ پر غالب آئیں گے۔ مگر ضروری ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان یہ فرق باعتبار کمیت ہو نہ کہ باعتبار نوعیت۔ یعنی اہل باطل جس چیز میں "دوسو" ہوں، اہل حق کو اسی چیز میں "بیس" ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہو کہ ایک طرف دوسو بندوقیں ہوں اور دوسری طرف بیس تلواریں تو یہ وعدہ متحقق نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں فرق کمیت کا نہ رہا، نوعیت کا ہو گیا۔ اسی طرح اگر اہل اسلام کے پاس روایتی علم ہو اور اہل باطل کے پاس سائنسی علم۔ اہل اسلام جوش سے مسلح ہوں اور اہل باطل نے ہوش کا خزانہ جمع کر رکھا ہو، اہل اسلام کے پاس زمانہ سے بے خبری ہو اور اہل باطل کے پاس زمانہ سے آگاہی، اہل اسلام کے پاس اختلاف کا سرمایہ ہو اور اہل باطل کے پاس اتحاد کا۔ اہل اسلام کے پاس بے ترتیبی ہو اور اہل باطل کے پاس منصوبہ بندی، اہل اسلام قدیم قوتوں کے مالک ہوں اور اہل باطل جدید قوتوں کے، تو اہل اسلام کو کبھی یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں نصرت خداوندی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان تمام صورتوں میں دونوں گروہوں کے درمیان نوعی فرق ہے اور جب نوعی فرق پایا جائے تو کسی بھی تعداد پر کوئی نصرت نازل نہیں ہوتی۔ جب بھی ایسا ہو کہ دونوں گروہوں کے درمیان فرق باعتبار نوعیت ہو جائے تو اہل اسلام کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے کمیت کی سطح پر لے آئیں۔ اس کے بعد ہی وہ نصرت الٰہی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ (الاسلام، صفحہ ۹۲-۹۰)

ایک لیڈر جب وزیر ہو جائے یا کسی بڑے سیاسی عہدہ پر پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لئے اپنے محکمہ میں کوئی کام نہیں رہتا، اس کا کام ہمیشہ کسی ایسے مقام پر ہوتا ہے جو اس سے ہزاروں میل دور ہو۔ اس کے قدموں کے نیچے جو زمین ہے، وہ مسائل کا انبار لئے ہوئے کراہ رہی ہوگی، مگر یہ کراہ اس کو سنائی نہ دے گی، البتہ دور کے کسی مقام پر مسائل انسانی پر ایک سیمینار ہو رہا ہو تو اس کا افتتاح کرنے کے لئے اس کے پاس کافی وقت ہوگا۔ ہمارے حکمرانوں کی اسی روش کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک عظیم ملک اتنی لمبی مدت سے ان کے زیر انتظام ہے، مگر وہ ملک کو اس کے سوا کوئی اور تحفہ نہ دے سکے کہ اس کو مہنگائی، رشوت، بدعنوانی اور بے انصافی سے بھر دیں۔

یہی روایت ہمارے ملّی رہنماؤں میں بھی گھس آئی ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی پہنچ اتنی بلند نہیں جتنی ملک کے سیاسی عہدہ داروں کی ہو سکتی ہے۔ تاہم اپنے دائرہ میں وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہرا رہے ہیں جس کا نمونہ ان کے حکمرانوں نے ۳۰ سال سے قائم کر رکھا ہے۔ ہمارے ہر رہنما کا یہ حال ہے کہ اس کے قدموں کے نیچے اس کے لئے کوئی کام نہیں۔ چھوٹے رہنماؤں کی پرواز چند سو میل کے دائرہ تک محدود ہے۔ جو اس سے بڑے ہیں ان کا کام ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے اور جو اور بڑے ہیں وہ بین اقوامی دائرہ میں اپنی خدمات انجام دینے کے لئے کام پا رہے ہیں۔ غرض ہر ایک کا کام دور کے کسی علاقہ میں واقع ہے جہاں وہ چند روز کے لئے مہمان بن کر جائے اور اعزازات کے ماحول میں شان دار تقریر کر کے اس طرح لوٹے کہ دوبارہ اسی قسم کے کسی دور دراز مقام پر واقع ایک اسٹیج اس کے جلوؤں کا انتظار کر رہا ہو۔

بخدا یہ کام کرنے کا طریقہ نہیں۔ اگر ہمارے رہنماؤں کی یہ روش باقی رہی تو ۱۹۴۷ء کے بعد کے دور کو بھی ہم اسی طرح کھو دیں گے جس طرح اس سے پہلے کے دور کو ہم کھو چکے ہیں۔ کام کا یہ طریقہ صرف عالی شان قیادتیں وجود میں لا سکتا ہے وہ عالی شان قوم وجود میں نہیں لا سکتا۔ اس قسم کی قیادتیں قوم کو جو آخری وراثت دے سکتی ہیں، وہ صرف شان دار مقبرے ہیں۔ وہ قوم کو شان دار مستقبل تک نہیں پہنچا سکتیں۔

کیا لوگوں کو یہ ڈر نہیں کہ خدا کے یہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ جو مواقع انھیں دیئے گئے تھے ان کو انھوں نے کہاں خرچ کیا۔ یا وہ اتنے نادان ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔

آدم سے مسیح تک

خدا کی طرف سے جتنے رسول آئے، سب اس لئے آئے کہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے باخبر کر دیں، یہ حقیقت کہ موجودہ دنیا کی زندگی، انسان کی ابدی زندگی کا صرف ایک امتحانی وقفہ ہے۔ کم و بیش سو سال یہاں زندگی گزار کر ہم اپنی مستقل دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں خدا کے وفادار بندوں کے لئے جنت ہے اور اس کے نافرمان بندوں کے لئے جہنم۔

آدمؑ پہلے انسان بھی تھے اور پہلے رسول بھی۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ ابو امامہ کی روایت میں آیا ہے کہ ابو ذر غفاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیار کی تعداد کے بارے میں سوال کیا آپؐ نے فرمایا، ایک لاکھ ۲۴ ہزار۔ ان میں تین سو پندرہ رسول بھیجے۔ (رواہ احمد و ابن راہویہ فی مسندیہما و ابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی المستدرک) خدا کے ان نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا اور خدا سے ڈر کر زندگی گزارنے کی تلقین کی۔ مگر انسانوں میں بہت کم ایسے لوگ نکلے جو اپنی آزادی عمل کو خدا کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں۔ حضرت یحییٰؑ کو کوئی ساتھی نہیں ملا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو چھوڑا تو ان کے ساتھ ان کی صرف دو لڑکیاں تھیں۔ حضرت نوحؑ کے ساتھ، ان کی کشتی کا قافلہ، توریت کے بیان کے مطابق، صرف آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے وطن عراق سے نکلے تو ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ تھیں اور ان کے بھتیجے لوط۔ بعد کو اس قافلہ میں ان کے دو بیٹے اسماعیل اور اسحاق شامل ہوئے۔ حضرت مسیحؑ کو ساری کوشش کے بعد بارہ آدمی ملے، وہ بھی آخر وقت میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بیشتر انبیار کا حال یہی رہا ہے۔ کوئی تنہا رہ گیا۔ کسی کو چند ساتھ دینے والے ملے۔ ان چند میں بھی زیادہ تر ان کے اپنے اہل خاندان تھے جن سے رشتے کا تعلق نبی کا ساتھ دینے کے لئے ایک اضافی محرک بن گیا۔ قرآن کی یہ آیت اس پوری تاریخ پر ایک تبصرہ ہے:

يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ	افسوس ہے بندوں کے حال پر جب بھی ان کے پاس کوئی رسول آیا تو انھوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔

انسانی نسل میں خدا کے نزدیک سب سے اہم ہستیاں وہ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ساری تاریخ میں یہی لوگ سب سے زیادہ غیر اہم رہے ہیں۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے واقعات تاریخ نے مکمل طور پر ضبط کئے۔ مگر آدم سے مسیح تک کوئی نبی ایسا نہیں جس کو باقاعدہ طور پر مدون تاریخ میں جگہ ملی ہو۔ حتیٰ کہ بیشتر رسولوں کے نام تک ہم کو معلوم نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام انبیار کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ ان کی قوم نے ان کو رد کر دیا۔ ان کے گھروں کو اجاڑا گیا، ان کو معاشرہ میں بے قیمت کر کے رکھ دیا گیا، ان کو

ایسا بنادیا گیا کو یا وہ اتنے غیر اہم لوگ ہیں جن کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

نبیوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے: اپنی مخاطب قوموں کی روش پر تنقید۔ انسان کو سب سے زیادہ جو چیز محبوب ہے، وہ ہے اپنی تعریف۔ اور جو چیز سب سے زیادہ مبغوض ہے، وہ ہے اپنے خلاف تنقید۔ انبیار چونکہ صحیح اور غلط کو بتانے کے لئے آتے ہیں، وہ اپنے ہم قوموں سے مصالحت نہیں کرتے۔ وہ ان کی اعتقادی اور عملی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس لئے قوم ان کی مخالف بلکہ دشمن ہو جاتی ہے۔ انبیار اگر لوگوں کی دل پسند تقریریں کرتے تو کبھی ان کو اس صورت حال سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔

اس عمومی انجام میں صرف چند نبیوں کا استثنار ہے۔ مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام۔ مگر ان حضرات کو جو عروج و اقتدار ملا، وہ ان کے نظریات کی عوامی مقبولیت کا نتیجہ نہ تھا۔ اس کے اسباب بالکل دوسرے تھے۔

حضرت داؤد اسرائیلی بادشاہ ساؤل کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی تھے۔ ان کے زمانہ میں اسرائیلیوں اور فلسطیوں میں جنگ ہوئی۔ فلسطی فوج میں جالوت نام کا ایک دیو ہیکل پہلوان تھا جس سے مقابلہ کرتے ہوئے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو شخص اس کو قتل کرے گا میں اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دوں گا۔ حضرت داؤد نے مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ اس طرح وہ اسرائیلی بادشاہ کے داماد بن گئے۔ اس کے بعد جب ایک جنگ میں بادشاہ اور اس کا ولی عہد دونوں ہلاک ہو گئے تو تخت حضرت داؤد کے حصہ میں آگیا۔ حضرت سلیمان آپ کے بیٹے تھے اور ان کو حکومت اپنے باپ سے وراثت میں ملی۔ حضرت یوسف کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ اس سے مصر کا مشرک بادشاہ متاثر ہو گیا، اور اس نے اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحت حکومتی انتظامات آپ کے سپرد کر دیے۔ تاہم بادشاہ اور عام مصری باشندے بدستور اپنے مشرکانہ دین پر قائم رہے۔

اس صورت حال کا نقصان صرف یہی نہیں ہوا کہ ہر دور کی بیشتر آبادی خدا کی نعمتِ ہدایت سے محروم رہی۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے جو کتاب اور پیغامات لے کر آتا تھا، اس کے بعد اس کو محفوظ رکھنے کا سامان نہ ہو سکا۔ کیونکہ پیغمبر کے بعد اس کے متبعین ہی اس کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر وہ یا تو حاصل نہیں ہوئے یا اتنے کم تھے کہ سماج کے علی الرغم کلام الٰہی کی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔

خدا جس کا علم ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے، جو آنے والے مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح گزرے ہوئے ماضی کو، اسے انسانیت کا یہ انجام معلوم تھا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی یہ مقدر کر دیا تھا کہ پیغمبرانہ دور کے آخری مرحلہ میں وہ اپنا ایک خاص نمائندہ بھیجے گا۔ اس پیغمبر کو دعوت دین کے ساتھ اظہار دین کی نسبت بھی حاصل ہوگی۔ اس کو یہ نصرت خاص دی جائے گی کہ وہ ہر حال میں اپنے مدعوئین پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کو حق کے آگے جھکنے پر مجبور کرے (لن یقبضہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء) خدا کی فوج اس کا ساتھ دے کر اس کے مخالفوں کو زیر کرے گی، تاکہ خدا کا دین ہمیشہ کے لئے مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے۔ اور خدا کی کتاب کی حفاظت کا مستقل انتظام ہو سکے۔ بائبل کے

کے الفاظ میں "جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہوا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان سے معمور ہو (حبقوق ۲:۱۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منصوبہ کو، بائبل کی شہادت کے مطابق، ہزاروں برس پہلے سے مختلف انبیاء کے ذریعہ مظاہر کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ نبی عرب کے صحرائی جغرافیہ سے اٹھے گا۔ وہ بنی اسرائیل کے بقیہ گھرانے یعنی ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) کی اولاد سے ہوگا۔ وہ حضرت مسیح کے بعد آئے گا۔ اس کے ساتھی خدا کے خریدے ہوئے کہلائیں گے۔ جو قومیں ان سے ٹکرائیں گی پاش پاش ہو جائیں گی۔ ازلی پہاڑ (ایران و روم جھک جائیں گے۔ اس کی سلطنت خشکی سے لے کر بحری ممالک تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ وغیرہ

موجودہ بائبل اگرچہ ترجمہ اور الحاقات کے نتیجہ میں اصل بائبل سے بہت کچھ مختلف ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی کثیر تعداد میں اس کے اندر ایسے بیانات موجود ہیں جو ایک غیر جانب دار آدمی کے لئے آنے والے آخری نبی کے سوا کسی اور ذات پر صادق نہیں آتے۔ خاص طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری کا تو خاص مشن یہی تھا کہ وہ دنیا کو خصوصاً یہود کو آنے والے نبی سے آخری طور پر آگاہ کر دیں۔ آپ نے جس "نئے عہدنامہ" کی بشارت دی وہ حقیقۃً اسلام تھا جو یہود کی معزولی کے بعد بنی اسماعیل کے ذریعہ باندھا گیا۔ انجیل نئے عہدنامہ کی بشارت ہے نہ کہ خود نیا عہدنامہ۔

حضرت مسیح علیہ السلام، نبی آخر الزماں سے چھ سو سال قبل تشریف لائے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت مسیح نے فلسطین کے یہودیوں سے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک آنے والے نبی سے پہلے اس کا مبشر بنا کر بھیجا ہے جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا (الصف — ۶)

احمد اور محمد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ انجیل برناباس میں صاف صاف لفظ "محمد" آیا ہے۔ تاہم چونکہ مسیحی حضرات انجیل برناباس کو جعلی انجیل کہتے ہیں، اس لئے ہم اس کا حوالہ مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز ہمیں اس میں شبہ ہے کہ حضرت مسیح نے اپنی پیشین گوئی میں لفظ احمد یا محمد کہا ہوگا۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ آپ نے احمد یا محمد کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال فرمایا۔

محمد بن اسحاق (م ۱۵۲ھ) کی ایک روایت جو ابن ہشام نے نقل کی ہے، اس کے مطابق یہ لفظ غالباً منحمنّا تھا۔ ابن اسحاق سیرت کے موضوع پر سب سے زیادہ اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ مجھے بتانے والوں نے بتایا کہ یحنس (یوحنا) کی انجیل میں آنے والے رسول کی جو پیشین گوئی ہے، اس میں اس کا نام منحمنا بتایا گیا ہے (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد اول، صفحہ ۵۰) اغلباً یہ روایت انھیں اپنے زمانہ کے فلسطینی عیسائیوں کی معرفت پہنچی جو اس وقت اسلام کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ منحمنّا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ ماضی کے اثر سے اس وقت تک فلسطین کے باشندوں کی زبان سریانی تھی۔ اغلب ہے کہ حضرت مسیح اپنی مادری زبان میں بولا ہوا اصل لفظ (منحمنّا) انجیل کی روایات میں چلا آ رہا تھا جو بعد کے ترجموں میں باقی نہ رہ سکا۔

یہاں ہم بائبل (قدیم اور جدید عہدناموں) سے کچھ اقتباسات بغیر کسی کمی یا اضافہ کے نقل کرتے ہیں۔

نبوت محمدی کا ظہور

ایک طرف افریقہ اور دوسری طرف ایشیا اور یورپ کے وسط میں عرب کا جزیرہ نما قدیم آباد دنیا کا جغرافی قلب معلوم ہوتا ہے۔ مگر قدیم زمانہ کے سیاسی حوصلہ آزماؤں میں کوئی نہیں ملتا جس نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی ہو۔ تمام فوجی مہمیں عرب کے سرحدی علاقوں — عراق، شام، فلسطین، لبنان اور یمن پر آکر ٹھہر گئیں۔ اس سے آگے نجد و حجاز کے علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی ضرورت انھوں نے نہیں سمجھی۔ کیوں کہ تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہونے کے باوجود یہاں ان کے لئے خشک پہاڑ اور اڑتی ہوئی ریت کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا۔

اسی "بے آب و گیاہ" وادی کی مرکزی بستی مکہ میں پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب آپ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے انتقال کر گئے۔ والدہ کا انتقال بھی اس وقت ہو گیا جب کہ آپ کی عمر ابھی صرف چھ سال تھی۔ اب آپ کے سرپرست آپ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم تھے تاہم دو سال بعد وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔ آخر عمر میں آپ کی سرپرستی آپ کے چچا ابوطالب بن عبدالمطلب کے حصہ میں آئی۔ مگر ہجرت کے تین سال پہلے، آپ کی زندگی کے مشکل ترین مرحلہ میں، ان کے لئے بھی موت کا پیغام آگیا۔

اگرچہ فطرت سے آپ نے بڑی شاندار شخصیت پائی تھی۔ بچپن میں آپ کو دیکھنے والے کہا اٹھتے: ان لھذا الغلام لشانا (اس لڑکے کا مستقبل عظیم ہے) جب بڑے ہوئے تو آپ کے شخصی رعب و وقار کا حال یہ تھا کہ حضرت علی کے الفاظ میں: من رآہ بدیھۃ ھابہ ومن خالطہ احبہ (جو آپ کو پہلی بار دیکھتا مرعوب ہو جاتا، جو ساتھ بیٹھتا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا) مگر چالیس سال کی عمر میں جب آپ نے دعوت نبوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو آپ کا دعویٰ اتنا حقیر معلوم ہوا کہ انھوں نے کہا: ھذا ابن ابی کبشۃ یکلم من السماء۔ اس کا مطلب تھا: دیکھو یہ فلاں دیہاتی کا لڑکا، وہ سمجھتا ہے کہ آسمان سے اس کو وحی آتی ہے۔

آپ کی دعوتی جدوجہد کی کل مدت صرف ۲۳ سال ہے۔ مگر اس انتہائی مختصر مدت میں عرب کے قبائل میں آپ نے ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں دنیا کی دو بڑی شہنشاہیتوں، ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کو زیر کر لیا اور ایک طرف عراق و ایران سے لے کر بخارا تک، دوسری طرف شام و فلسطین سے لے کر مصر اور پورے شمالی افریقہ تک کو فتح کر لیا۔ پھر یہ سیلاب مغربی سمت بڑھا اور ۷۱۱ء میں جبرالٹر سے گزر کر اسپین اور پرتگال میں داخل ہو گیا۔ مغربی یورپ میں قافلہ اسلام کی پیش قدمی ۷۳۲ء میں شاہ فرانس چارلس کارٹل نے تور کے مقام پر روک دی۔ تاہم دو صدیوں تک یورپ کی صلیبی جنگوں اور اس کے بعد تاتاریوں کے بے پناہ حملوں کے باوجود پندرھویں صدی تک اس کو کوئی

حقیقی نقصان نہیں پہنچا، جب کہ انھوں نے اپنے اندرونی اختلاف کی وجہ سے اسپین کو کھودیا۔

اس کے بعد اسلام کی اندرونی طاقت نے ترکوں اور مغلوں کو کھڑا کیا۔ ترکوں نے ۱۴۵۳ میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ تک پہنچ گئے۔ وائنا کے سامنے ۱۶۸۳ تک ایک ترک فوج موجود تھی۔ سولھویں صدی میں مغلوں نے برصغیر ہند اور افغانستان کے علاقہ میں اسلام کا اقتدار قائم کیا۔ تیرہ صدیوں کے بعد اس توسیع کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں مسلمان موجود ہیں۔ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک تقریباً چار درجن ممالک کا ایک مسلم علاقہ بن چکا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے شائع کردہ عالمی مسلم گزیٹیر (۱۹۷۵) کے مطابق آج دنیا بھر میں اہل اسلام کی تعداد ۹۰ کروڑ ہے۔

یہ سب جو ہوا، اس ۲۳ سالہ عمل کا نتیجہ تھا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں عرب میں انجام دیا گیا تھا۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک ایسا انقلاب آنا جو نہ صرف تاریخ انسانی میں دائمی طور پر ثبت ہو جائے بلکہ خود اپنی ایک مستقل تاریخ پیدا کرے، کسی انسان کے بس کی چیز نہیں۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا اور اسی نے اس کو انجام دیا۔

بدر کی فتح کے بعد جب مسلمان واپس ہوئے تو روحا کے مقام پر کچھ لوگ ملے جنھوں نے ان کو فتح کی مبارک باد دی۔ سلمہ بن سلامہ نے جواب دیا: تم لوگ کس چیز کی مبارک باد دے رہے ہو۔ خدا کی قسم یہ تو گویا بندھے ہوئے اونٹ تھے جن کو ہم نے ذبح کر دیا۔ (کانا بل المعقلة فنحرناها، تہذیب سیرۃ ابن ہشام - ۱۵۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام سے پیشگی اس کے اسباب فراہم کر دیے تھے۔ عرب کے خشک جغرافیہ میں ایک ایسی قوم جمع کر دی گئی جس میں صحرائی زندگی کے نتیجہ میں کردار کی صلابت غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی۔ وہ اقرار اور انکار کے درمیان کسی تیسری چیز کو نہ جانتے تھے، ان کے اندر وہ تمام فطری خصائص پوری طرح محفوظ تھے جو کسی تحریک کا مجاہد بننے کے لئے ضروری ہیں۔ پھر عرب کے جزیرہ نما کے گرد اس وقت کی دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتیں قائم کر دی گئی تھیں، بالکل فطری تھا کہ وہ اپنے پڑوس میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو برداشت نہ کریں اور اس کے خلاف جارحیت کا آغاز کر دیں۔ اس طرح ان کی جارحیت اہل اسلام کے لئے جواز فراہم کر دے کہ وہ دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک ملکوں کو فتح کرتے چلے جائیں۔ کیوں کہ عملاً اس وقت کی تقریباً تمام دنیا انھیں دونوں جارح قوموں کا علاقہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی لڑائیاں دوسروں کے خلاف جارحیت نہیں تھیں۔ بلکہ یہ دوسروں کی جارحیت کا جواب تھا جو ہمیشہ تمام دنیا میں جائز سمجھا گیا ہے۔

اس طرح جو واقعات ظہور میں آئے۔ ان کی اہمیت صرف سیاسی تھی۔ اس سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ اس انقلاب کے ذریعہ انسانی تاریخ کے بند دروازے کو کھول دینا مقصود تھا۔ اس کے ذریعہ وہ انقلاب آنا تھا جو دین حق کو ایک تاریخی حقیقت بنا دے، جو اس سے پہلے تاریخی واقعہ کی حیثیت حاصل کرنے سے محروم تھا۔ وہ پریس کا دور لے آئے جس کے بعد متن کی دائمی حفاظت کا انتظام ہو جائے۔ آزادی اور جمہوریت کا زمانہ آئے جو اعیان حق کے لئے حق کی اشاعت کی راہ سے تمام مصنوعی رکاوٹوں کو ہٹا دے۔ اس سے طبیعیاتی علوم کی وہ دریافتیں ظاہر ہوں جو دین کی

صداقت کو عقلیاتی سطح پر مدلل و مبرہن کر دیں۔

اس انقلاب کا اس سے بھی اہم پہلو یہ ہے کہ نبی کے ذریعہ اللہ تعالٰے نے قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دکھادیا۔ سچے لوگوں کو آپ کے ذریعہ غالب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی برتری حاصل کریں گے، اور برے لوگوں کو آپ کے ذریعہ مغلوب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی پستی اور مغلوبیت کا شکار رہیں گے۔

تاریخ کا یہ اندوہناک منظر ہے کہ خدا کے سچے پرستار یہاں ہمیشہ دبے اور پسے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دولت اور اقتدار کو پوجنے والوں کو یہاں تفوق حاصل رہتا ہے۔ تمام انبیاء اور صلحاء کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ یہ صورت حال حقیقی صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ بالآخر جو ہونے والا ہے، وہ تو یہ کہ خدا اپنے پرستاروں کو دائمی عزت اور برتری عطا فرمائے گا اور جو لوگ اپنے نفس کی اور دنیا کی پوجا میں لگے رہے، ان کو ہمیشہ کے لئے ذلت اور رسوائی میں دھکیل دے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں لوگوں کو موقع ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس لئے کہ یہاں خدا کسی کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ تاہم پیغمبر اسلام کے ذریعہ، کم از کم ایک بار اس زمین پر وہ منظر ابتدائی شکل میں دکھادیا گیا ہے جو کامل اور دائمی صورت میں آخرت میں سامنے آنے والا ہے۔ آپ کے ساتھی جن کا حال یہ تھا کہ ان کے گھروں کو اجاڑ دیا گیا، جن کے لئے زمین کو تنگ بنا دیا گیا، جن کی معاشیات تباہ کر دی گئیں، جن کو اس قدر خوف و ہراس میں مبتلا کیا گیا کہ ان کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا کہ لوگ انھیں اچک لیں گے ان کو عزت اور اقتدار کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ دوسری طرف قریش اور یہود، رومی اور ایرانی، یمنی اور غسانی جو دولت اور اقتدار کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، ان کو ذلیل کر کے پستی کے گڑھے میں ڈال دیا گیا۔

ہر نبی جو خدا کی طرف سے آتا ہے، وہ زمین پر خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ اس کی معرفت خدا اپنے ان فیصلوں سے لوگوں کو باخبر کرتا ہے جس کو وہ آخرت میں براہ راست خود سنانے والا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کے ذریعہ یہ عدالت الٰہی ایسی خصوصی شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہ خود تاریخ انسانی کا جزو بن گئی۔ جس طرح بہت سے دوسرے انسانی تجربات تاریخی حقیقت کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، اسی طرح یہ واقعہ بھی ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے انسانی معلومات میں ثبت ہو چکا ہے کہ خدا اپنے متقی بندوں کو سرفراز کرتا ہے اور جو لوگ سرکشی اختیار کریں، ان کو ذلت و بربادی کے دائمی عذاب میں دھکیل دیتا ہے جنت اور جہنم اگرچہ دوسری دنیا میں قائم ہونے والی حقیقتیں ہیں۔ مگر انسان کی نصیحت کے لئے اللہ نے اس کا ایک ابتدائی منظر اسی دنیا میں لوگوں کو دکھادیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعثت محمدی کا ظہور، خدا کی خدائی کا ظہور تھا، اسی لئے انجیل میں اس کو "خدا کی بادشاہت" سے تعبیر کیا گیا ہے آپ کے لائے ہوئے انقلاب کی بلاشبہ سیاسی اور عمرانی اہمیت بھی ہے اور دوسری بہت سی اہمیتیں بھی۔ مگر اس کی سب سے اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کے جلال کا مشاہدہ کراتا ہے۔ وہ خدا کی عدالت کا منظر دکھا رہا ہے، اس نے ان حقیقتوں کو آخرت سے پہلے انسان کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے جن کو انسان آخرت میں اپنی کامل شکل میں دیکھے گا۔

بائبل کی پیشین گوئیاں

اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہوا۔ جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلہ سے برکت پائیں گے۔ سو ابرام خداوند کے کہنے کے مطابق چل پڑا اور لوط اس کے ساتھ گیا۔ اور ابرام پچھتر برس کا تھا جب وہ حاران سے روانہ ہوا۔ اور ابرام نے اپنی بیوی ساری اور اپنے بھتیجے لوط کو اور سب مال کو جو انھوں نے جمع کیا تھا اور ان آدمیوں کو جو ان کو حاران میں مل گئے تھے، ساتھ لیا اور وہ ملک کنعان کو روانہ ہوئے۔ اور ملک کنعان میں آئے۔ اور ابرام اس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اسے دکھائی دیا تھا، ایک قربان گاہ بنائی۔ (پیدائش ۱۲: ۱-۷)

جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں۔ تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہو گیا اور خدا نے اس سے ہم کلام ہو کر فرمایا کہ دیکھ۔ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہیں ہوگا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا۔ کیوں کہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرا دیا ہے۔ اور میں تجھے بہت برومند کروں گا اور قومیں تیری نسل سے ہوں گی اور بادشاہ تیری اولاد میں سے برپا ہوں گے۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا، باندھوں گا، تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے۔ اور میں ان کا خدا ہوں گا۔ (پیدائش ۱۷: ۱-۸)

اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے، چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے۔ دریغ نہ رکھا، اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کناروں کی ریت کی مانند کر دوں گا۔ اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی۔ اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔ کیوں کہ تو نے میری بات مانی۔ (پیدائش ۲۲: ۱۵-۱۸)

اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو یہ کہہ کر بلوایا کہ تم سب جمع ہو جاؤ تاکہ میں تم کو بتاؤں کہ آخری دنوں میں تم پر کیا

کیا گزرے گا۔ اے یعقوب کے بیٹو جمع ہو کر سنو اور اپنے باپ اسرائیل کی طرف کان لگاؤ (پیدائش ۴۹: ۱-۲)
یہوداہ سے سلطنت نہیں چھوٹے گی اور نہ اس کی نسل سے حکومت کا عصا موقوف ہوگا، جب تک کہ وہ نہ آیا جو بھیجا جانے والا ہے۔ اور قومیں اس کی مطیع ہوں گی۔ وہ اپنا جوان گدھا انگور کے درخت سے باندھا کرے گا۔ (۱۰-۱۱)

(موسیٰ نے کہا اے اسرائیلیو) خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثنا ۱۸: ۱۵-۱۹)

اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے۔ اور اس نے کہا۔ خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ اور دس ہزار قدوسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا ۳۳: ۱-۲)

خدا ہم پر رحم کرے اور ہم کو برکت بخشے۔ اور اپنے چہرہ کو ہم پر جلوہ گر فرمائے۔ تاکہ تیری راہ زمین پر ظاہر ہو جائے۔ اور تیری نجات سب قوموں پر۔ اے خدا لوگ تیری تعریف کریں۔ سب لوگ تیری تعریف کریں۔ امتیں خوش ہوں اور خوشی سے للکاریں۔ کیوں کہ تو راستی سے لوگوں کی عدالت کرے گا۔ اور زمین کی امتوں پر حکومت کرے گا۔ اے خدا! لوگ تیری تعریف کریں۔ سب لوگ تیری تعریف کریں۔ زمین نے اپنی پیداوار دے دی۔ خدا یعنی ہمارا خدا ہم کو برکت دے گا۔ خدا ہم کو برکت دے گا۔ اور زمین کی انتہا تک سب لوگ اس کا ڈر مانیں گے۔

خدا اٹھے۔ اس کے دشمن پراگندہ ہوں۔ اس سے عداوت رکھنے والے اس کے سامنے سے بھاگ جائیں۔ جیسے دھواں اڑ جاتا ہے، ویسے ہی تو ان کو اڑا دے۔ جیسے موم آگ کے سامنے پگھل جاتا ہے، ویسے ہی شریر خدا کے حضور فنا ہو جائیں۔ لیکن صادق خوشی منائیں۔ وہ خدا کے حضور شادماں ہوں۔ بلکہ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ خدا کے لئے گاؤ۔ اس کے نام کی مدح سرائی کرو۔ صحرا کے سوار کے لئے شاہراہ تیار کرو۔ (زبور ۶۷-۶۸)

اے خدا، بادشاہ کو اپنے احکام اور شہزادہ کو اپنی صداقت عطا فرما۔ وہ صداقت سے تیرے لوگوں کی اور انصاف سے تیرے غریبوں کی عدالت کرے گا۔ ان لوگوں کے لئے پہاڑوں سے سلامتی کے اور پہاڑیوں سے صداقت کے پھل پیدا ہوں گے۔ وہ ان لوگوں کے غریبوں کی عدالت کرے گا۔ وہ محتاجوں کی اولاد کو بچائے گا۔ اور ظالم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ جب تک سورج اور چاند قائم ہیں، لوگ نسل در نسل تجھ سے ڈرتے رہیں گے۔ وہ کٹی ہوئی گھاس پر مینھ کی مانند اور زمین کو سیراب کرنے والی بارش کی طرح نازل ہوگا۔ اس کے ایام میں صادق برومند ہوں گے۔

اور جب تک چاند قائم ہے، خوب امن رہے گا۔ اس کی سلطنت سمندر سے سمندر تک اور دریائے فرات سے زمین کی انتہا تک ہوگی۔ بیابان کے رہنے والے اس کے آگے جھکیں گے۔ اور اس کے دشمن خاک چاٹیں گے۔ ترسیس کے اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزرانیں گے۔ سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے لائیں گے۔ بلکہ سب بادشاہ اس کے سامنے سرنگوں ہوں گے۔ کل قومیں اس کی مطیع ہوں گی۔ کیونکہ وہ محتاج کو جب وہ فریاد کرے اور غریب کو جس کا کوئی مددگار نہیں، چھڑائے گا۔ اور غریب اور محتاج پر ترس کھائے گا اور محتاجوں کی جان کو بچائے گا۔ وہ فدیہ دے کر ان کی جان کو ظلم اور جبر سے چھڑائے گا اور ان کا خون اس کی نظر میں بیش قیمت ہوگا۔ وہ جیتے رہیں گے اور سبا کا سونا اس کو دیا جائے گا۔ لوگ برابر اس کے حق میں دعا کریں گے۔ وہ دن بھر اسے دعا دیں گے۔ زمین میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اناج کی افراط ہوگی۔ ان کا پھل لبنان کے درختوں کی طرح جھومے گا۔ اور شہر والے زمین کی گھاس کی مانند ہرے بھرے ہوں گے۔ اس کا نام ہمیشہ قائم رہے گا۔ جب تک سورج ہے، اس کا نام رہے گا۔ اور لوگ اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گے۔ سب قومیں اسے خوش نصیب کہیں گی۔ (زبور ۔ ۷۲)

مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں۔ وہ سدا تیری تعریف کریں گے۔ مبارک ہے وہ آدمی جس کی قوت تجھ سے ہے۔ جس کے دل میں صیئون کی شاہراہیں ہیں۔ وہ وادی بکا (BACA) سے گزر کر اسے چشموں کی جگہ بنا لیتے ہیں بلکہ پہلی بارش اسے برکتوں سے معمور کر دیتی ہے۔ وہ طاقت پر طاقت پاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صیئون میں خدا کے حضور حاضر ہوتا ہے۔ (زبور ۸۴ : ۴ ۔ ۷)

اے یاہ! تجھ سا زبردست کون ہے، میرا ہاتھ اس کے ساتھ رہے گا۔ میرا بازو اسے تقویت دے گا۔ دشمن اس پر جبر نہ کرنے پائے گا۔ اور شرارت کا فرزند اسے نہ ستائے گا۔ میں اس کے مخالفوں کو اس کے سامنے مغلوب کروں گا۔ اور اس سے عداوت رکھنے والوں کو ماروں گا۔ پر میری وفاداری اور شفقت اس کے ساتھ رہیں گی۔ اور میرے نام سے اس کا سینگ بلند ہوگا۔ میں اس کا ہاتھ سمندر تک بڑھاؤں گا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ کو دریاؤں تک۔ وہ مجھے پکار کر کہے گا تو میرا باپ، میرا خدا، اور میری نجات کی چٹان ہے۔ میں اسی کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا۔ اور دنیا کا شہنشاہ۔ میں اپنی شفقت کو اس کے لئے ابد تک قائم رکھوں گا۔ اور میرا عہد اس کے ساتھ لاتبدیل رہے گا۔ میں اس کی نسل کو ہمیشہ تک قائم رکھوں گا۔ اور اس کے تخت کو جب تک آسمان ہے۔ اگر اس کے فرزند میری شریعت کو ترک کر دیں اور میرے احکام پر نہ چلیں، اگر وہ میرے آئین کو توڑیں اور میرے فرمان کو نہ مانیں تو میں ان کو چھڑی سے خطا کی اور کوڑوں سے بدکاری کی سزا دوں گا۔ لیکن میں اپنی شفقت اس پر سے ہٹا نہ لوں گا۔ اور اپنی وفاداری کو باطل ہونے نہ دوں گا۔ میں اپنے عہد کو نہ توڑوں گا۔ اور اپنے منہ کی بات کو نہ بدلوں گا۔ اس کی نسل ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور اس کا تخت آفتاب کی مانند میرے حضور قائم رہے گا۔ وہ ہمیشہ چاند کی طرح اور آسمان کے سچے گواہ کی مانند قائم رہے گا۔ (زبور ۸۹ : ۸، ۲۱ ۔ ۳۷)

اے سب اہل زمین! اس کے حضور کانپتے رہو۔ قوموں میں اعلان کرو کہ خداوند سلطنت کرتا ہے۔ جہان قائم ہے

اور اسے جنبش نہیں۔ وہ راستی سے قوموں کی عدالت کرے گا۔ آسمان خوشی منائے اور زمین شادماں ہو۔ سمندر اور اس کی معموری شور مچائیں۔ میدان اور جو کچھ اس میں ہے، باغ باغ ہوں۔ تب جنگل کے سب درخت خوشی سے گانے لگیں گے۔ خداوند کے حضور، کیونکہ وہ آرہا ہے۔ وہ زمین کی عدالت کرنے کو آرہا ہے۔ وہ صداقت سے جہان کی اور اپنی سچائی سے قوموں کی عدالت کرے گا (زبور ۹۶: ۹ - ۱۳)

خداوند سلطنت کرتا ہے۔ زمین شادماں ہو۔ بے شمار جزیرے خوشی منائیں۔ بادل اور تاریکی اس کے ارد گرد ہیں۔ صداقت اور عدل اس کے تخت کی بنیاد ہیں۔ آگ اس کے آگے آگے چلتی ہے۔ اور چاروں طرف اس کے مخالفوں کو بھسم کر دیتی ہے۔ اس کی بجلیوں نے جہان کو روشن کر دیا۔ زمین نے دیکھا اور کانپ گئی۔ خداوند کے حضور پہاڑ موم کی طرح پگھل گئے۔ یعنی ساری زمین کے خداوند کے حضور۔ آسمان اس کی صداقت ظاہر کرتا ہے۔ سب قوموں نے اس کا جلال دیکھا ہے۔ کھدی ہوئی مورتوں کے سب پوجنے والے جو بتوں پر فخر کرتے ہیں، شرمندہ ہوں۔ ۔ ۔ ۔ وہ ان کو شریروں کے ہاتھ سے چھڑاتا ہے۔ صادقوں کے لئے نور بویا گیا ہے۔ (زبور ۹۷)

صداقت کے پھاٹکوں کو میرے لئے کھول دو۔ میں ان سے داخل ہو کر خداوند کا شکر کروں گا۔ خداوند کا پھاٹک یہی ہے۔ صادق اس سے داخل ہوں گے۔ میں تیرا شکر کروں گا۔ کیونکہ تو نے مجھے جواب دیا۔ اور خود میری نجات بنا ہے۔ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور ہماری نظر میں عجیب ہے، یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا۔ ہم اس میں شادماں ہوں گے اور خوشی منائیں گے۔ (زبور ۱۱۸: ۱۹ - ۲۴)

دیکھو میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں۔ میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر ڈالی۔ وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا۔ وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنی جائے گی۔ وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا۔ وہ راستی سے عدالت کرے گا۔ وہ ماندہ نہ ہو گا اور نہ ہمت ہارے گا، جب تک عدالت کو زمین پر قائم نہ کر لے۔ جزیرے اس کی شریعت کا انتظار کریں گے (یسعیاہ ۴۲: ۱-۴)

گزر جاؤ، پھاٹکوں میں سے گزر جاؤ۔ لوگوں کے لئے راہ درست کرو اور شاہراہ اونچی اور بلند کرو۔ پتھر چن کر صاف کر دو۔ لوگوں کے لئے جھنڈا کھڑا کرو۔ دیکھ خداوند نے انتہائے زمین تک اعلان کر دیا ہے۔ دختر صیون سے کہو، دیکھ تیرا نجات دینے والا آتا ہے۔ دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے سامنے ہے اور وہ مقدس لوگ اور خداوند کے خریدے ہوئے کہلائیں گے۔ اور تو مطلوبہ یعنی غیر متروک شہر کہلائے گی۔ (یسعیاہ ۶۲: ۱۰-۱۲)

تیرے لوگوں اور تیرے مقدس شہر کے لئے ستر ہفتے مقرر کئے گئے کہ خطاکاری اور گناہ کا خاتمہ ہو جائے۔ بدکرداری کا کفارہ دیا جائے۔ ابدی راست بازی قائم ہو۔ رویا و نبوت پر مہر ہو اور پاک ترین مقام ممسوح کیا جائے۔ (دانی ایل ۹: ۲۴)

صیون میں نرسنگا پھونکو۔ میرے کوہ مقدس پر سانس باندھ کر زور سے پھونکو۔ ملک کے تمام باشندے تھرتھرائیں۔ کیوں کہ خداوند کا روز چلا آتا ہے، بلکہ آپہنچا ہے۔ اندھیرے اور تاریکی کا روز۔ ابر سیاہ اور ظلمات کا روز ہے۔ ایک بڑی اور زبردست امت جس کی مانند نہ کبھی ہوئی اور نہ سالہائے دراز تک اس کے بعد ہو گی، پہاڑوں پر صبح صادق کی طرح

پھیل جائے گی۔ گویا ان کے آگے آگے بھسم کرتی جاتی ہے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے شعلہ جلاتا جاتا ہے۔ ان کے آگے زمین باغ عدن کی مانند ہے اور ان کے پیچھے ویران بیابان ہے۔ ہاں ان سے کچھ نہیں بچتا۔ ان کی نمود گھوڑوں کی سی ہے اور سواروں کی مانند دوڑتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رتھوں کے کھڑکھڑانے اور بھوسے کو بھسم کرنے والے شعلہ آتش کے شور کی مانند بلند ہوتے ہیں۔ وہ جنگ کے لئے صف بستہ زبردست قوم کی مانند ہیں۔ ان کے روبرو لوگ تھرتھراتے ہیں۔ سب چہروں کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ وہ پہلوانوں کی طرح دوڑتے اور جنگی مردوں کی طرح دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ سب اپنی اپنی راہ پر چلتے ہیں اور صف نہیں توڑتے۔ وہ ایک دوسرے کو نہیں دھکیلتے۔ ہر ایک اپنی راہ پر چلا جاتا ہے۔ وہ جنگی ہتھیاروں سے گزر جاتے ہیں اور بے ترتیب نہیں ہوتے۔ وہ شہر میں کود پڑتے اور دیواروں اور گھروں پر چڑھ کر کھڑکیوں سے گھس جاتے ہیں۔ ان کے سامنے زمین و آسمان کانپتے اور تھرتھراتے ہیں۔ سورج اور چاند تاریک اور ستارے بے نور ہو جاتے ہیں اور خداوند اپنے لشکر کے سامنے للکارتا ہے۔ کیونکہ اس کا لشکر بے شمار ہے اور اس کے حکم کو انجام دینے والا زبردست ہے۔ کیونکہ خداوند کا روز عظیم نہایت خوفناک ہے۔ کون اس کو برداشت کر سکتا ہے۔ (یوایل ۲: ۱-۱۱)

رب الافواج اسرائیل کا خدا فرماتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم، یقیناً موآب، سدوم کی مانند ہو گا اور بنی عمون عمورہ کی مانند۔ وہ پرخار و نمک زار اور ابدالآباد برباد رہیں گے۔ میرے لوگوں کا بقیہ ان کو غارت کرے گا۔ اور میری قوم کے باقی لوگ ان کے وارث ہوں گے۔ یہ سب کچھ ان کے تکبر کے سبب سے ان پر آئے گا۔ کیوں کہ انھوں نے رب الافواج کے لوگوں کی ملامت کی اور ان پر زیادتی کی۔ خداوند ان کے لئے ہیبت ناک ہو گا اور زمین کے تمام معبودوں کو لاغر کر دے گا اور بحری ممالک کے سب باشندے اپنی اپنی جگہ میں اس کی پرستش کریں گے (صفنیاہ ۲: ۹-۱۱)

جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان سے معمور ہو گی (۲: ۱۴)
خدا تیمان سے آیا۔ اور قدوس کوہ فاران سے۔ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا۔ اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔ اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں۔ اور اس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔ وبا اس کے آگے آگے چلتی تھی۔ اور آتشی تیر اس کے قدموں سے نکلتے تھے۔ وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہو گئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حبقوق ۳: ۳-۶)

دیکھو، میں اپنے رسول کو بھیجوں گا۔ اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہو گا۔ ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزومند ہو، آئے گا، رب الافواج فرماتا ہے۔ پر اس کے آنے کے دن کی کس میں تاب ہے۔ اور جب اس کا ظہور ہو گا تو کون کھڑا رہ سکے گا۔ کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابون کی مانند ہے۔ اور وہ چاندی کو تانے اور پاک صاف کرنے والے کی مانند بیٹھے گا۔ اور بنی لاوی کو سونے اور چاندی کی مانند پاک صاف کرے گا تاکہ وہ راستبازی سے خداوند کے حضور ہدیے گزرانیں (ملاکی ۳: ۱-۳)

رب الافواج فرماتا ہے، اس روز وہ میرے لوگ بلکہ میری خاص ملکیت ہوں گے۔ اور میں ان پر ایسا رحیم ہوں گا جیسا باپ اپنے خدمت گزار بیٹے پر ہوتا ہے۔ تب تم رجوع لاؤ گے اور صادق اور شریر میں، اور خدا کی عبادت

کرنے والے اور نہ کرنے والے میں امتیاز کروگے۔ کیونکہ دیکھو وہ دن آتا ہے جو بھٹی کی مانند سوزاں ہوگا۔ تب سب مغرور اور بدکردار بھوسے کی مانند ہوں گے۔ اور وہ دن ان کو ایسا جلائے گا کہ شاخ و بن کچھ نہ چھوڑے گا۔ (ملاکی ۳: ۱۷-۱۸، ۴: ۱)

نیا عہد نامہ

یسوع مسیح نے ان سے کہا، کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور ہماری نظر میں عجیب ہے"۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو، جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ (متی ۲۱: ۴۲-۴۴)

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے۔ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے۔ کیا تو ایلیاہ ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا، میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔ یہ فریسیوں کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے۔ یوحنا نے جواب میں ان سے کہا کہ میں پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں۔ تمھارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے۔ یعنی میرے بعد کا آنے والا جس کی جوتی کا تسمہ میں کھولنے کے لائق نہیں۔ (یوحنا ۱: ۱۹-۲۶)

(یسوع نے کہا) اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔ (یوحنا ۱۴: ۱۶) میں نے یہ باتیں تمھارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا (۲۵-۲۶) اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں (۱۴: ۳۰) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا (۱۶: ۷-۸) مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ (۱۲-۱۴)

خداوند فرماتا ہے دیکھ، وہ دن آتے ہیں کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے سے ایک نیا عہد

باندھوں گا۔ یہ اس عہد کی مانند نہ ہو گا جو میں نے ان کے باپ دادا سے اس دن باندھا تھا جب ملک مصر سے نکال لانے کے لئے ان کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس واسطے کہ وہ میرے عہد پر قائم نہیں رہے اور خداوند فرماتا ہے کہ میں نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ پھر خداوند فرماتا ہے کہ جو عہد اسرائیل کے گھرانے سے ان دنوں کے بعد باندھوں گا وہ یہ ہے کہ میں اپنے قانون ان کے ذہن میں ڈالوں گا اور ان کے دلوں پر لکھوں گا۔ اور میں ان کا خدا ہوں گا اور وہ میری امت ہوں گے۔ (عبرانیوں کے نام ۸ : ۸ — ۱۰)

پھر میں نے ایک اور فرشتہ کو آسمان کے بیچ میں اڑتے ہوئے دیکھا۔ جس کے پاس زمین کے رہنے والوں کی ہر قوم اور قبیلہ اور اہل زبان اور امت کے سنانے کے لئے ابدی خوش خبری تھی۔ اور اس نے بڑی آواز سے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اس کی تمجید کرو۔ کیونکہ اس کی عدالت کا وقت آ پہنچا ہے اور اس کی عبادت کرو جس نے آسمان اور زمین اور سمندر اور پانی کے چشمے پیدا کئے۔ پھر اس کے بعد ایک اور دوسرا فرشتہ یہ کہتا ہوا آیا کہ گر پڑا۔ وہ بڑا شہر بابل گر پڑا جس نے اپنی حرام کاری کی غضب ناک مے تمام قوموں کو پلائی ہے۔ (یوحنا کا مکاشفہ ۱۴ : ۶-۸) پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید بادل ہے اور اس بادل پر آدم زاد کی مانند کوئی بیٹھا ہے جس کے سر پر سونے کا تاج اور ہاتھ میں تیز درانتی ہے۔ پھر ایک اور فرشتہ نے مقدس سے نکل کر اس بادل پر بیٹھے ہوئے سے بڑی آواز کے ساتھ پکار کر کہا کہ اپنی درانتی چلا کر کاٹ کیوں کہ کاٹنے کا وقت آ گیا۔ اس لئے کہ زمین کی فصل بہت پک گئی۔ پس جو بادل پر بیٹھا تھا، اس نے اپنی درانتی زمین پر ڈالی اور زمین کی فصل کٹ گئی (۱۴-۱۶)

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے۔ جو سچا اور برحق کہلاتا ہے۔ اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں۔ اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہے۔ اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور صاف مہین کتانی کپڑے پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں انگور روندے گا۔ اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے:

بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند۔ (مکاشفہ ۱۹ : ۱۱-۱۶)

پھر میں نے ایک فرشتہ کو آسمان سے اترتے دیکھا، اس نے اژدہا یعنی پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے، پکڑ کر ہزار برس کے لئے باندھا اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا اور اس پر مہر کر دی تاکہ وہ ہزار برس کے پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے۔ اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی یعنی جوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کیلئے جمع کرنے کو نکلے گا۔ اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور آسمان پر سے آگ نازل ہو کر انھیں کھا جائیگی (مکاشفہ ۲۰ : ۱-۹)

بائبل کی ان پیشین گوئیوں کے مطابق پچھلے نبیوں کے ذریعے بتا دیا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں کیا ہونے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو صاحبزادے تھے۔ اسحاقؑ اور اسماعیلؑ۔ آپ نے اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں آباد کیا اور اسمٰعیل اور ان کی ماں (ہاجرہ) کے ساتھ اپنے وطن عراق سے نکلے اور خدا کے حکم سے ان کو لے کر مورہ (مروہ) کے علاقہ میں آئے۔ یہاں انھوں نے ایک قربان گاہ (کعبہ) کی تعمیر کی۔ اپنے فرزند اسماعیل کو یہاں بسایا۔ خدا نے کہا تیری اس اولاد کی نسل میں میری برکت (نبوت) ظاہر ہوگی۔ اس سے میں ابدی عہد باندھوں گا (دائمی شریعت عطا کروں گا) اس کے وسیلے سے سب قومیں فیض پائیں گی (وہ عالمی نبوت ہوگی)

بنی اسرائیل کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں جب نئے عہد والا نبی آئے گا تو اسرائیلی نسل (یہود) سے سلطنت چھین لی جائے گی۔ بنی اسرائیل کو جب احکام الٰہی دیئے گئے تو وہ براہ راست دیئے گئے جس کی وجہ سے انھیں دہشت ناک کیفیات سے گزرنا پڑا۔ بنی اسرائیل کے بقیہ (بنی اسماعیل) میں جو نبی آئے گا، خدا اس کے قلب پر اپنا حکم اتارے گا، اور وہ اپنے منھ سے دہرا کر اس کو دوسروں کو بتائے گا۔ سینا (مصر) سے موسٰی کی نبوت ظاہر ہوئی۔ شعیر (فلسطین) سے عیسٰی کی نبوت، اب نبی آخر الزماں کا ظہور فاران (عرب) سے ہوگا۔ وہ تعریف کیا ہوا (محمد) کہلائے گا۔ لوگ دن بھر اس کے لئے دعا (درود وسلام) کرتے رہیں گے۔

اسماعیلی نبی جو صحرائی علاقہ میں آئے گا، صرف پیغام نہیں پہنچائے گا، وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کرے گا۔ وہ مظلوموں (غلاموں) کو اوپر اٹھائے گا اور ظالموں کو زیر کرے گا۔ اس کا اقتدار قیامت تک ختم نہ ہوگا۔ توحید کے پرستار اس کے عہد میں غلبہ حاصل کریں گے، بیابان کے رہنے والے (قریش) اس کے آگے جھک جائیں گے۔ اس کے دشمن (یہود) ذلیل ہوں گے۔ یمن اور اطراف عرب کے حکمراں اس کے مطیع ہوں گے۔ ازلی پہاڑ (روم و ایران) اس کے سیلاب کے آگے پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ یہ پیغمبر ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا (اس کا فیض نبوت جاری رہے گا وہ سب باتیں (مکمل شریعت) بتائے گا۔

اس کی حکومت نہ صرف خشکی کے آخری سرے تک ہوگی بلکہ اس سے گزر کر سمندر پار کے علاقوں تک پہنچ جائے گی۔ وہ خدائی عدالت کو زمین پر قائم کرے گا۔ اس کی نبوت نبیوں کے سلسلے پر مہر کرے گی۔ پاک ترین مقام (کعبہ) مرکز توحید قرار پائے گا۔

اس پیغمبر کے ماننے والے خدا کے خریدے ہوئے کہلائیں گے (اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ) وہ جنگ میں صف بستہ ہو کر لڑیں گے (يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا) وہ پہلوانوں کی طرح دوڑیں گے اور دیواروں (خیبر کے قلعوں پر) چڑھ جائیں گے۔ یہ پیغمبر (فتح مکہ کے دن) دس ہزار ساتھیوں کو لے کر اچانک اپنی ہیکل (خانہ کعبہ) میں آموجود ہوگا۔ اس پیغمبر کے امتی اگر خدا کے احکام کو ترک کر دیں، تب بھی وہ سابق امتوں کی طرح معزول نہ کیے جائیں گے۔ صرف تنبیہ کی سزا انھیں دی جائے گی۔

ڈاکٹر تاراچند

جنھوں نے اسلامی تاریخ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر تاراچند (۱۹۷۳-۱۸۸۸) فارسی زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ اسی لیے پنڈت نہرو نے ۱۹۵۲ء میں ان کو ایران کا سفیر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے سراکبر (اپنشد کا فارسی ترجمہ، از دارا شکوہ) کو اڈیٹ کیا تھا جس کو حکومت ایران نے خصوصی اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔

۱۹۱۳ میں انھوں نے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ کائستھ پاٹھ شالہ (ڈگری کالج) میں استاد ہوگئے۔ کائستھ پاٹھ شالہ ٹرسٹ کے صدر کرنل رنجیت سنگھ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ٹرسٹ کے اگزیکیٹو کے سامنے تجویز پیش کی کہ نوجوان استاد کو ریسرچ کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ بیشتر ممبروں نے شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ مگر کرنل رنجیت سنگھ نے بزور اس تجویز کو منظور کرایا اور ان کے سفر کے تمام انتظامات کیے۔

اس کے بعد ڈاکٹر تاراچند آکسفرڈ گئے۔ وہاں وہ کوئنس کالج میں تین سال (۲۲-۱۹۱۹) رہے۔ اور ڈی۔ فل کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا، ہندوستانی کلچر پر اسلام کا اثر:

THE INFLUENCE OF ISLAM
ON INDIAN CULTURE

حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے تحت انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ پر چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کی تیاری میں اپنی آخری زندگی کے ۱۴ سال صرف کیے۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۱۹۶۱ء میں اور چوتھی جلد ۱۹۷۳ میں شائع ہوئی۔

مسٹر سریش رام نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر تاراچند کے غیر جانب دارانہ رائے قائم کرنے DISPASSIONATE JUDGMENT کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی میں کانگریس کا مسلم لیگ کو وزارت میں شریک نہ کرنا ایک انتہائی نزاعی مسئلہ ہے۔ مگر اس کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند نے لکھا:

ADMITTING THAT THERE COULD BE TWO OPINIONS CONCERNING THE CONSTITUTIONAL PROPRIETY OF THE DECISION TO REFUSE THE APPOINTMENT OF THE MUSLIM LEAGUERS TO THE CONGRESS CABINET, IT IS DIFFICULT TO JUSTIFY ITS WISDOM. (Vol. IV, P. 238)

یہ مانتے ہوئے کہ کانگرس کابینہ میں مسلم لیگی نمائندوں کو شریک کرنے کی قانونی اہمیت پر دو رائیں ہو سکتی ہیں، اس کی معقولیت کو ثابت کرنا سخت مشکل ہے۔

نیشنل ہیرلڈ (لکھنؤ)، ۲ نومبر ۱۹۷۶

ڈاکٹر تاراچند کا خاتمہ بظاہر اس بات کی علامت تھا کہ غیر مسلموں میں وہ نسل اب ختم ہوگئی جو اردو، عربی، فارسی زبانیں جانتی ہو اور اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب کے پس منظر میں سوچنے کی علمی صلاحیت رکھتی ہو۔ مگر حالیہ برسوں میں پٹرول کی کرامت نے از سر نو عربی اور فارسی کو زندہ کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم ان موضوعات میں داخلے لے رہے ہیں۔ یہ بھی شاید بالواسطہ طور پر اس حدیث نبوی کی تصدیق ہے کہ یہ دین ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سیاسی اور زمانی انقلابات کبھی اس میں کامیاب نہ ہوں گے کہ خدا کے دین کو ماضی کی چیز بنا کر تاریخ کی الماری میں بند کر دیں۔

خاتون اسلام

از فریدہ خانم ایم اے

اسمار بنت ابوبکر ہجرت سے ۲۷ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ مکہ میں جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو مسلمانوں کی تعداد سترہ تھی۔ حضرت ابوبکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے پاس تقریباً چھ ہزار درہم تھے۔ وہ سب ساتھ لے گئے تھے۔

حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ جو نابینا ہو گئے تھے۔ بعد کو پوتیوں کے پاس تسلی کے لیے آئے اور کہنے لگے: میرا خیال ہے کہ ابوبکر نے اپنے جانے کا صدمہ بھی تم کو پہنچایا اور مال بھی شاید سب لے گیا۔ اسمار کہتی ہیں کہ میں نے اپنے دادا سے کہا، وہ تو ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کئے — اور اس طاق میں بھر دیا جس میں میرے والد کے درہم پڑے رہتے تھے۔ اور ان کے اوپر ایک کپڑا ڈال کر دادا کا ہاتھ اس کپڑے پر رکھ دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ درہم سے بھرے ہوئے ہیں۔ کہا، خیر یہ ابوبکر نے اچھا کیا۔ اس سے تم لوگوں کے گزارہ کی صورت ہو جائے گی۔

اسمار کہتی ہیں کہ خدا کی قسم کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے صرف دادا کی تسلی کے لیے یہ صورت اختیار کی تھی۔

حضرت اسمار کی شادی حضرت زبیر سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب دونوں ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو اس وقت جو حال ہوا۔ وہ صحیح بخاری میں ان کی زبان سے اس طرح نقل ہوا ہے۔

جب میرا نکاح زبیر سے ہوا تو ان کے پاس نہ مال تھا نہ جائیداد۔ نہ کوئی خادم کام کرنے والا، نہ کوئی اور چیز۔ ایک اونٹ پانی لاد کر لانے کے لیے تھا اور ایک گھوڑا۔ میں ہی اونٹ کے لیے گھاس وغیرہ لاتی تھی اور کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر دانہ کے طور پر کھلاتی تھی۔ میں ہی پانی بھر کر لاتی اور پانی کا ڈول پھٹ جاتا تو اس کو آپ ہی سیتی تھی۔ مجھ ہی کو گھوڑے کی ساری خدمت کرنی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ گھر کا سارا کام بھی انجام دینا ہوتا۔ ان سب کاموں میں گھوڑے کی خبر گیری میرے لیے زیادہ مشقت کی چیز تھی۔ روٹی البتہ مجھ کو اچھی طرح پکانا نہیں آتی تھی۔ اس لیے جب روٹی پکانا ہوتا تو میں آٹا گوندھ کر اپنے پڑوس کی انصار عورتوں کے یہاں لے جاتی۔ وہ

زمین کو انسان کی قیام گاہ بنایا گیا ہے۔ مگر وہی قیام گاہ زمین کے اوپر کھڑی ہوتی ہے جس کی تعمیر کو بنیاد سے شروع کر کے چھت تک پہنچایا گیا ہو۔ کوئی شخص چھت کی طرف سے اپنا مکان بنانا شروع کر دے تو خدا کی زمین ایسے مکان کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔

یہ اس دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ جب ملت کی تعمیر کا سوال آتا ہے تو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ چھت کی طرف سے ملت کا محل اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ ان کا محل بالآخر زمین بوس ہو کر مایوسی اور بے یقینی کے ملبہ کے سوا ان کے لیے کچھ اور نہ چھوڑے۔

بڑی مخلص عورتیں تھیں۔ میری روٹی بھی پکا دیتیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے پر زبیر کو ایک زمین جاگیر کے طور پر دیدی جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھی۔ میں وہاں کام کے لیے جایا کرتی اور وہاں سے اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں لاد کر لاتی۔

ایک بار میں اس طرح آرہی تھی اور گٹھری میرے سر پر تھی۔ راستہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ وہ اونٹ پر آرہے تھے اور انصار کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر اونٹ کو ٹھہرایا۔ اور اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تاکہ میں اس پر بیٹھ جاؤں۔ مجھے مردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آئی اور یہ بھی خیال آیا کہ زبیر کو غیرت بہت زیادہ ہے ان کو یہ ناگوار نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے انداز سے سمجھ گئے کہ مجھ کو اونٹ پر بیٹھتے ہوئے شرم آرہی ہے چنانچہ آپ آگے بڑھ گئے۔

میں گھر کو آئی اور زبیر کو پورا واقعہ سنایا۔ میں نے کہا کہ مجھے مردوں کے ساتھ اونٹ پر بیٹھتے ہوئے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا بھی خیال آیا۔ زبیر نے کہا، خدا کی قسم تمہارا گٹھلیاں سر پر رکھ کر لانا میرے لیے اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔

مدینہ کی زندگی میں عورتوں کے اس طرح کثرت سے واقعات ہیں۔ اس وقت عورتیں نہ صرف گھر کا بلکہ باہر کا بھی اکثر کام کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرد زیادہ تر جہاد اور تبلیغ دین وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ ان کو موقع نہیں ملتا تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ چنانچہ ان کی عورتوں نے گھر کے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ حتیٰ کہ جانوروں کی دیکھ بھال اور زراعت اور باغبانی بھی وہ کرنے لگی تھیں۔

کام میں انہماک

سر جادو ناتھ سرکار (۱۸۷۰-۱۹۵۸) کو مغل تاریخ کا کولمبس کہا جاتا ہے۔ یہ مقام انھیں کس غیر معمولی انہماک کے ذریعہ ملا، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر رگھو بیر سنہہ کو اپنی عمر کے آخری ۲۷ برسوں میں لکھے۔ ۸۰ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی ان کے اندر کام کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کلکتہ میں اپنے وسیع مکان کو چھوڑ کر وہ صرف اس لئے کامشیت چلے گئے کہ کلکتہ کے ناموافق موسم کی وجہ سے وہ وہاں پوری طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ منتخب ۳۲۹ خطوط جس زمانہ (۱۹۳۲-۱۹۵۸) سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں ملک کے اندر اور باہر زبردست واقعات ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم، ہندستان کی آزادی، مہاتما گاندھی کا قتل، وغیرہ۔ مگر خطوط میں ان واقعات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تاہم دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کی خبر انھیں متاثر کرتی ہے ۲۸ جون ۱۹۴۵ کو وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"اگر تم اپنے لندن کے فوٹو گرافر کو خط لکھو تو اس کو ہدایت کرو کہ وہ برٹش میوزیم کے (فلاں) مخطوطہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لے لے۔ یورپ میں امن قائم ہو جانے کی وجہ سے برٹش میوزیم نے اپنے مخطوطات کے ذخیرہ کو شاید دوبارہ نکال لیا ہو جو (جنگ کے زمانہ میں) تہ خانوں میں رکھ دیئے گئے تھے"

آپ بیتی

۱۹۵۴ء میں جب کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں انجنیئرنگ کا طالب علم تھا، ایک واقعہ پیش آیا جو کہ اب تک مجھے یاد ہے۔ میرے استاد ڈاکٹر پران ناتھ نے لاپلاس ٹرانسفارم کو پڑھانا شروع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی ہے جو ہمارے موجودہ پرنسپل سے متعلق ہے۔ یہ پروفیسر ایم۔ سین۔ گپتا تھے جو اس وقت ہندو یونیورسٹی کے انجنیئرنگ کالج کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر گپتا مزید تعلیم کے لیے گلاسگو یونیورسٹی گئے تھے اور وہاں سے انھوں نے ٹاپ کیا تھا۔ گلاسگو کا پروفیسر ایک روز بلیک بورڈ پر ایک الیکٹریکل پرابلم کو حل کر رہا تھا۔ اسی درمیان میں DIFFERENTIAL EQUATION کا ایک سوال آگیا۔ گلاسگو پروفیسر نے اس کو عام طریقے سے حل کیا جس میں کافی وقت لگا اور سارا بلیک بورڈ بھر گیا۔

پروفیسر گپتا نے اس موقع پر اپنے پروفیسر سے کہا: میرا خیال ہے کہ یہاں لاپلاس ٹرانسفارم کو اپلائی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ سوال بہت مختصر طریقہ سے حل ہو جائے گا۔ پروفیسر نے اس تجویز پر عمل کیا تو صرف دو لائنوں میں سوال حل ہو گیا۔ اگرچہ دونوں طریقوں کا آخری جواب ایک ہی تھا۔ مگر پروفیسر نے کہا: جب مختصر طریقہ ہمارے پاس موجود ہے تو لمبے طریقے کو اختیار کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نے بلیک بورڈ پر اپنے حل کو مٹا دیا اور پروفیسر گپتا کے طریقہ کو لکھتے ہوئے کہا:

THIS IS THE ONLY METHOD یہی واحد طریقہ ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ۱۹۶۴ء کا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے امریکی حکومت کے ایجوکیشن ڈویژن کے تعاون سے "سمر اسکول فار ٹیچرس" کا ایک پروگرام شروع کیا۔ ہندوستانی شخصیتوں کے علاوہ تین امریکی پروفیسر آئے تھے۔ اس وقت میں چنڈیگڑھ پالی ٹکنیک میں سینیئر لکچرر تھا اور اسی حیثیت سے چنڈی گڑھ کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا کورس تھا جو ۱۵ جون سے ۲۴ جولائی ۱۹۶۴ء تک ہوا۔

امریکی پروفیسر میچل نے ایک روز کلاس میں سوال کیا: WHO ARE CREATIVES تخلیقی لوگ کون ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف نام لیے۔ ایک شخص نے کہا پوئیٹ (شاعر) پروفیسر نے کہا، کیا (WHAT) پروفیسر میچل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بار بار "واٹ" کہتے رہے اور ہمارے ساتھی بار بار "پوئیٹ" دہراتے رہے۔ بالآخر انھوں نے اس کی اسپلنگ بتائی: پی او ای ٹی۔ اب پروفیسر میچل سمجھ گئے کہ ہمارے ساتھی کی مراد شاعر سے ہے۔ مگر ہندوستانی اور امریکی تلفظ کے فرق کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ ہندوستانی تلفظ اس لفظ کا پوئیٹ ہے جبکہ امریکی تلفظ میں اس کو پائیٹ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

YOU ARE RIGHT, I AM WRONG BECAUSE I AM IN YOUR COUNTRY

آپ صحیح ہیں۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت آپ کے ملک میں ہوں۔

عبد المحیط خاں (پیدائش ۱۹۳۲ء)
پرنسپل گورنمنٹ پالی ٹکنک فیض آباد

ایک فتنہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲۲ میں ارشاد ہوا ہے :

ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے، سب کے ساتھ یہ قصہ ضرور پیش آیا کہ جب اس نے اللہ کا کلام پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہہ ڈال دیا۔ پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے خیال کو مٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ اپنی آیات کو اور مضبوط کر دیتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔ اس واسطے تاکہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو اللہ ان لوگوں کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں۔ اور بلاشبہ یہ ظالم مخالفت میں دور جا پڑے ہیں۔ اور ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ جن لوگوں کو سمجھ ملی ہے، وہ جان لیں کہ نبی جو کچھ سنا رہا ہے، وہ یقیناً رب العالمین کی طرف سے ہے۔ پھر وہ اس پر یقین کریں اور ان کے دل اس کی طرف جھک جائیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایمان والوں کو اللہ ہی راہ راست دکھاتا ہے۔ (حج)

اصل متن میں تمنیٰ اور امنیہ کا لفظ ہے۔ تمنیٰ کا لفظ یہاں بمعنی قرأت اور امنیہ بمعنی متلو استعمال ہوا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ایک شاعر نے کہا تھا :

تمنیٰ کتاب اللہ اول لیلتہٖ　　　　واخرھا لاقیٰ حمام المقادر

شروع رات میں آپ نے کتاب اللہ کی تلاوت کی اور آخر رات میں مقدر موت سے جا ملے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ وہ اپنے نمائندے بھیجتا ہے جو لوگوں کو اس کے احکام سناتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے شیطان کو بھی پورا موقع دے رکھا ہے۔ ہر زمانہ میں ایسا ہوا کہ جب پیغمبر نے اللہ کی بات کا اعلان کیا تو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی باتیں ڈال کر انھیں شبہہ میں مبتلا کر دیا۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی آیت سنائی انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم، تو شیطان نے یہ شبہ ڈالا :

"ما تعبدون من دون اللہ میں تو مسیح اور عزیر اور ملائکہ بھی شامل ہیں، تو کیا یہ سارے جہنم کا ایندھن بنیں گے؟"

جب کوئی سچی بات پیش کی جائے تو ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرے اور سیدھی طرح اس کو مان لے۔ یہ سچے طالبان حق کا طریقہ ہے۔ مگر جن لوگوں کے دلوں میں سچی طلب نہیں ہوتی ان کا ذہن، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ داعی کی بات میں کوئی نہ کوئی ایسی غلطی نکالی جائے جس سے اپنے موقف کا جواز ثابت ہو جائے۔ اب ان کا ذہن الٹی طرف کام کرنے لگتا ہے وہ اصل بات میں طرح طرح کے شوشے نکالنا شروع کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں اس کی صداقت کو مشتبہ کر دیں۔ نیز خود بھی یہ جھوٹی تسکین حاصل کریں کہ ہم جس دعوت کے مخالف ہیں، وہ اسی قابل ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔

اس کی بے آمیز صداقت کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اسلاف کی تحمیق ہے۔ (انت تسفہ آباءنا) اس کی تاثیر یہ کہہ کر گھٹاتے ہیں کہ یہ ادبی سحر کاری ہے (بل ھو شاعر) داعی کے یقین اور حوصلہ کو یہ کہہ کر بے قیمت ٹھہراتے ہیں کہ یہ

سارا زور اس لیے ہے کہ فلاں شخص سے ان کو مدد مل گئی ہے (اعانہ علیہ قوم آخرون) کبھی یہ کہہ کر معاملہ کو مشتبہ کرتے ہیں کہ یہ تو ایک آدمی کی بات ہے (ان ھذا الا قول البشر) کبھی کہتے ہیں کہ یہ تو محض کچھ غیر اہم لوگوں کا قصہ ہے (اراذلنا بادی الرای) وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ داعی کی حیثیت کو مشتبہ اور اپنی پوزیشن کو مضبوط کیا جائے۔ مگر داعی حق کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے اور نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔

سبق آموز

قومی رہنمائی کے کام کے لیے صرف انھیں لوگوں کو اٹھنا چاہیے جو حال کے اندر مستقبل کو دیکھ سکتے ہوں۔ جن کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کا قومی رہنما بن کر اٹھنا، قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت

چودھری خلیق الزماں (۱۹۷۳ - ۱۸۸۸) پاکستان تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے کہا: "نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔" انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں دکھایا ہے کہ پاکستان کے اصل بانی وہی تھے۔ یہ انھیں کا تخیل تھا اور اس وقت تھا جب کہ مسٹر جناح بھی اس کے خلاف تھے۔

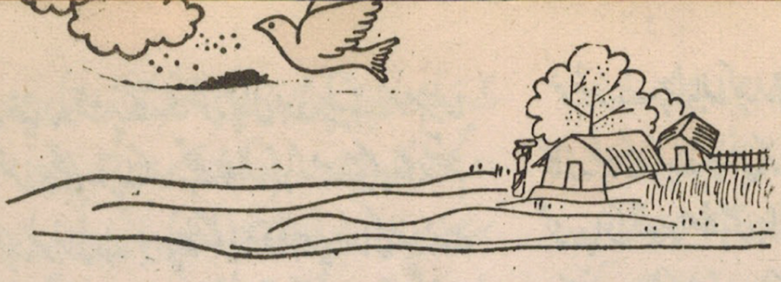
مگر آخر عمر میں چودھری صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ انھوں نے تقسیم ملک کی جو تحریک چلائی وہ غلط تھی۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور (۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء) میں ان کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس سے پھر روزنامہ جنگ میں نقل ہوا۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ یہ تھا:

"ممتاز مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں نے روزنامہ "جنگ" کے نمائندہ کو ایک ملاقات میں انٹرویو دیا اور برصغیر کی تقسیم کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تقسیم کرا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو کمزور کیا اور جن عظیم مقاصد کے لیے پاکستان قائم کیا تھا وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اب ہم ایک کوزہ میں بند ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی ۵ - ۶ کروڑ مسلمان ہیں۔ جن کی ہم کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند کرا کر ہم نے کوئی فائدہ حاصل کیا۔"

روزنامہ جنگ، راولپنڈی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۲ء صفحہ ۳

(ماخوذ از الفرقان، جنوری فروری ۱۹۷۳ء)

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے تمام قائدین، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، چودھری خلیق الزماں ہی کی مثال ثابت ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض لوگ مرتے ہوئے چودھری صاحب کی طرح اپنا اقرار نامہ لکھ کر قوم کو دے گئے۔ اور بیشتر کا حال یہ رہا کہ آخر وقت تک وہ یہی کہتے رہے یا کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے جو راہ اختیار کی وہی صحیح ترین راہ تھی، حالات کے بگاڑ میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں۔



روداد سفر

گنگاپور راجستھان کا ایک شہر ہے جو دہلی سے ۳۰۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۸ اگست ۱۹۷۷ کو ہم دہلی سے پتھروں کے اس شہر کے لئے روانہ ہوئے جہاں چھپر بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔ راستہ میں مسلسل سرسبز و شاداب مناظر آنکھوں کے لئے "جنت نظارہ" بن رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف ساری زمین سبز چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ جگہ جگہ ابھرے ہوئے درخت قدرتی گل بوٹے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ کھلے آسمان کا منظر اور اس میں بادلوں کی حسین ٹکڑیاں آفاقی حسن کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

"یہ شاداب حسن کس قدر لذت بخش ہے" میں نے سوچا" مگر وہ اپنے اندر تلخیاں بھی لئے ہوئے ہے۔ ہر سال جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر سرسبزی اور شادابی کا ایک اتھاہ حسن اُگ آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ کیچڑ اور سیلاب بھی لاتا ہے۔ مکانات گرتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوتی ہیں۔ بارش میں بھیگنے سے کتنی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مچھر، مکھی، کیڑے مکوڑے وغیرہ طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔"

سرسبز درخت قدرت کی اتنی حسین نعمت ہیں کہ آخرت میں بننے والی بے پایاں نعمتوں کی دنیا کا نام ہی جنت (باغ) رکھ دیا گیا۔ انسان کی حسین ترین تمنا ہمیشہ یہ رہی ہے کہ سرسبز درختوں کے جھرمٹ میں عمدہ رہائش گاہ (مساکن طیبۃ فی جنات عدن) اسے حاصل ہو۔ زمین پر سرسبزی کا انحصار زیر زمین آبی اہتمام کے ساتھ بڑی حد تک فضائی بارش پر ہے۔ بارش کے فضائی انتظام کی وجہ سے یہ تمام مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اس کی مصلحت یہ ہے کہ انسان ایک نعمت کو پاکر اس میں مگن نہ ہو جائے، بلکہ اس کی تلخیوں کو بھی بھگتے۔ تاکہ خدا کی یاد اس کے ذہن میں تازہ رہے۔ آخرت میں اس کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لئے وہاں سرسبزی کو قائم رکھنے کے لئے غالباً فضائی بارشوں کا انتظام ختم یا محدود کر دیا جائے گا۔ اور زیر زمین آبی اہتمام کو زیادہ کامل بنا دیا جائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ کہا گیا ہے کہ جنت میں سرسبز باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (جنّٰت تجری من تحتھا الانھار) گویا جنت میں آب رسانی کا نظام تحت زمینی ہوگا نہ کہ بالائے زمینی۔

گنگاپور میں تقریباً چھ ہزار مسلمان ہیں اور آٹھ مسجدیں ہیں۔ یہاں ایک رات گزری۔ تبلیغیوں والی مسجد میں فجر کی نماز کے بعد چند احادیث کی روشنی میں آخرت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ انسان اپنے دنیا کے "گھر" کو بہتر بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ زندگی سے زیادہ موت سے قریب ہے۔ کسی بھی وقت خدا کا فیصلہ آکر اس کے گھروندے کو منتشر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد نہ وہ ہوگا نہ اس کی بنائی ہوئی دنیا جس کے بل پر وہ گھمنڈ کرتا تھا۔

۹ اگست کی صبح کو ہم اگلے سفر کے لئے گنگاپور اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ

بجے ٹھیک وقت پر گاڑی شور مچاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ موت بھی اسی قسم کی ایک سواری ہے جو اپنے مقررہ وقت پر خدا کی طرف سے آتی ہے۔ کسی کے لئے وہ "مخصوص سواری" ہوگی جس پر آرام سے بٹھا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رب العالمین کی مہمانی کے لئے لے جایا جائے گا۔ کسی کے لئے وہ پولیس کی "کالی گاڑی" ہوگی جس کے تنگ و تاریک خول میں اس کو دھکا دے کر ڈال دیا جائے گا، اور کشاں کشاں خدا کی عدالت میں پہنچایا جائے گا تاکہ اس کے کبر اور سرکشی کی دردناک سزا اسے دی جائے۔

۱۰ بجے ہم ملارنا پہنچے۔ یہاں پہنچتے ہی جو پہلی خبر ملی وہ یہ کہ دو مسلم خاندان آپس میں لڑ گئے۔ راستہ بھر قدرتی مناظر سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا یہ کتاب الٰہی کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں جن کو پڑھتا ہوا میں ان کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ یہ ایک آفاقی نشرگاہ تھی جو خدائی پیغامات کو اس کی حسین ترین شکل میں نشر کر رہی تھی۔ "لوگ حقیقت سے اتنے بے خبر کیوں ہیں جب کہ زمین و آسمان سے مسلسل حقیقت کا اعلان ہو رہا ہے"، میں نے سوچا "خدائی پیغام رسانی کا یہ کام اتنے حسین، اتنے ابدی اور اتنے آفاقی انداز میں ہو رہا ہے کہ کوئی کان اس کو سننے سے محروم نہ رہے۔ کوئی آنکھ اس کے مشاہدہ سے خالی نہ رہے۔ پھر بھی کیوں ایسا ہے کہ لوگ اس کے سننے کے لئے بہرے ہیں اور آنکھیں اس کو دیکھنے کے لئے اندھی ہو رہی ہیں"۔

درخت کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے لئے سایہ اور پھل کی مانند بنو۔ پھول کہہ رہے ہیں کہ ایسے بنو کہ تم کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور لوگوں کو تم سے خوشبو ملے۔ چڑیاں کہہ رہی ہیں کہ خدا کی حمد کے نغمے گاؤ۔ ہوائیں کہہ رہی ہیں کہ لوگوں کے بیچ سے اس طرح گزر جاؤ کہ تمہارا سفر بھی جاری رہے اور کسی کو تم سے تکلیف نہ پہنچے۔ پہاڑ کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے درمیان صبر اور تحمل کی چٹان بن کر رہو۔ آسمان کہہ رہا ہے کہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھالو کہ نفرت اور شکایت کی باتیں تم کو حقیر نظر آنے لگیں ——— اس قسم کی بے شمار آوازیں کائنات میں ہر آن ابل رہی ہیں مگر وہ کسی کو سنائی نہیں دیتیں۔

خیال کا قافلہ یوں ہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک حدیث یاد آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے شب قدر کا علم دیا گیا اور میں مسجد سے نکلا کہ لوگوں کو بتادوں۔ اتنے میں دو مسلمان لڑ گئے۔ اس لئے وہ علم اٹھا لیا گیا۔ (فتلاحی الرجلان فرفعت) گویا جب لوگ باہمی لڑائی جھگڑے کی سطح پر ہوں تو علم الٰہی کی روشنی ان سے دور ہو جاتی ہے۔ خدائی کلام کو سننے کے لئے ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ معرفت خداوندی کا فیضان اسی قلب پر اترتا ہے جس کا دل دوسروں کے خلاف بغض و حسد سے خالی ہو۔ جس کا سینہ دوسروں کے خلاف نفرت کا کوڑا خانہ بنا ہوا ہو، اس میں علم خداوندی کو لے کر چلنے والے پاک فرشتے قدم نہیں رکھتے۔

۹ اگست کی شام کو ہم بھتیٹر (ضلع سوائی مادھوپور) پہنچے۔ یہ بستی دہلی سے تقریباً ۳۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بھتیٹر اور ملارنا دونوں قریب قریب بستیاں ہیں جن کو صرف ایک پہاڑی راستہ جدا کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا بازو معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں بستیوں میں کئی تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا موضوع مختلف پہلوؤں سے، خوف خدا اور فکر آخرت تھا۔

یہ پورا علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ سب سے اونچی چوٹی وہ ہے جو بہتیڑ اور ملارنا کے درمیان واقع ہے۔ اس کے اوپر شاہ محمد اسماعیل ملی کا مزار ہے۔ ہر جمعرات کے روز یہاں دیئے جلائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کئی دیواریں بالکل کالی ہو گئی ہیں۔ قبر پر دیا جلانا خود ناقابل فہم ہے۔ مگر یہ اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے کہ ایسا عمل کیا جائے جو "بزرگ" کی درو دیوار کو کالک لگانے کے ہم معنی بن جائے۔ تاہم ایک توہم پرست ذہن کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ توہم پرستی نام ہی ہے متضاد چیزوں کو ذہن میں جمع کرنے کا۔

اس پہاڑی کے اوپر دوسرا عجیب منظر بجلی کے کھمبے ہیں۔ بہتیڑ میں ابھی تک بجلی نہیں پہنچی۔ مگر اس غیر آباد بلند چوٹی پر، ملارنا سے، بجلی کے کھمبے پہنچا دیئے گئے ہیں یہ پچھلے الکشن (مارچ ۱۹۷۷) کی برکت ہے۔ تاہم تاروں کا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے یہ بجلی کے کھمبے ابھی تک قمقموں کے بوجھ سے خالی ہیں۔ ہم تقریباً دو درجن آدمیوں کے قافلے نے پہاڑ کی اس چوٹی پر عصر کی نماز ادا کی اور دو گھنٹے تک یہاں رہے۔ کھلا آسمان، تازہ ہوا، سرسبز میدان، پہاڑی سلسلے، ڈبڈبائی ہوئی ندیاں، چڑیوں کے چہچہے، غرض قدرت کے ماحول میں گزرنے والے یہ لمحات بڑے پر کیف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہم زندگی کی ایسی بلند سطح پر پہنچ گئے ہیں جہاں تمام پستیاں تحلیل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ مسائل جو زمین پر انسان کو الجھائے رہتے ہیں، یہاں بے حقیقت ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آخر میں یہاں ایک نشست ہوئی جس میں دعوتی کام کی اہمیت اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات پر اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱ اگست کو ہم گنگا پور ہوتے ہوئے دوبارہ دہلی واپس آ گئے۔ ہمارا یہ سفر مدرسہ نور الاسلام بہتیڑ (ضلع سوائی مادھوپور) کی دعوت پر ہوا۔ مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی اور مولانا محمد حسن خاں میواتی شریک سفر رہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں حکم دیا گیا ہے کہ دین کو قائم رکھو۔ (شوریٰ - ۱۲) اس آیت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی نے اقامت دین سے اتحاد مراد لیا ہے:

(ان اقیموا الدین) امر اللہ لجملۃ الانبیاء ان اقیموا الدین ان اتفقوا فی الدین (ولا تتفرقوا فیہ) لا تختلفوا فی الدین

(تفسیر عبداللہ بن عباس (مطبوعہ ۱۲۸۰ھ)

اللہ نے تمام پیغمبروں کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو، یعنی دین میں متفق رہو اور اس میں مختلف و متفرق نہ ہو جاؤ۔

اس تشریح کے مطابق اقامت دین کی آیت میں جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ مسلمان اس سورت حال سے بچیں جو عام طور پر حامل کتاب گروہ کے اندر زوال کے زمانہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی دین کے نام پر اختلاف و انتشار۔ یہ داخلی دینی اتحاد کا حکم ہے نہ کہ خارجی معرکہ آرائی کا۔

محاسن موضح قرآن

از مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

صفحات ۴۶۵ قیمت مجلد پندرہ روپے

پتہ: ادارہ رحمت عالم، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں، دہلی ۶

مصنف کتاب مولانا اخلاق حسین قاسمی پچھلے ۵۰ سال سے دہلی کی مساجد میں قرآن کا درس دیتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کے سامنے "دوسری تفاسیر کے ساتھ خاص طور پر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ اور تشریحی فوائد بھی نظر رہے ہیں (۱)، موصوف نے دیکھا کہ ناشرین کی بے پروائی سے شاہ صاحب کے ترجمہ اور فوائد میں اغلاط داخل ہوگئی ہیں۔ انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس قیمتی قرآنی خدمت کو اس کی اصل شکل میں محفوظ کیا جائے۔ شاہ صاحب کے ترجمہ کی تصحیح کی جائے اور مختلف قدیم نسخوں کو سامنے رکھ کر صحیح ترجمہ مرتب کیا جائے اور اس کی اشاعت ہو (۷)

شاہ صاحب نے ۴۰ سال معتکف رہ کر یہ ترجمہ ۱۲۰۵ (۱۷۹۰ء) میں مکمل کیا۔ اس کی اہمیت کے بارہ میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ایک اقتباس کافی ہوگا۔ ڈپٹی صاحب نے ۱۳۱۴ھ میں قرآن کا اپنا ترجمہ کیا تھا۔ اپنے مقدمہ میں انھوں نے لکھا: "(شاہ صاحب کے ترجمہ کے بعد) ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہوگیا۔ مگر خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا"

شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کافی استعمال کئے ہیں۔ "اس کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم طبقہ قرآن کے پیغام سے قریب ہو" (۱۳) اس طرح شاہ صاحب کے ترجمہ کو زندہ کرنے میں دو نسبتیں شامل ہوگئی ہیں۔ ایک عام مسلمانوں کو قرآن کے معانی سے واقف کرانا۔ دوسرے غیر مسلم حضرات تک قرآن کے پیغام کو پہنچانا۔

شاہ صاحب کا ترجمہ پہلی بار ۱۹۰۷ میں شائع ہوا۔ مگر یہ ابتدائی نسخہ آج غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ بعد کے ترجموں میں لوگوں نے بطور خود ترمیمات کرنی شروع کردیں اور تفسیری حواشی میں اضافے کر ڈالے۔ اب یہ متعین کرنا ایک مشکل کام بن گیا ہے کہ شاہ صاحب کا اصل ترجمہ اور حواشی کیا تھے۔ فاضل مصنف نے اس سلسلے میں غیر معمولی تحقیق کی ہے، اور اس سلسلے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل مصنف نے صرف شاہ صاحب کے ترجمہ کی علمی وتاریخی تحقیق ہی نہیں کی ہے۔ بلکہ اس میں خود تفسیری مسائل پر بھی قیمتی بحثیں درج ہیں۔

فاضل مصنف نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو صحیح کرکے اس کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے، اللہ تعالیٰ اس راہ میں موصوف کی مدد کرے تاکہ یہ کام بخوبی طور پر اپنی تکمیل کو پہنچے۔

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات کی روشنی میں

از مولانا محمد تقی امینی

ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

صفحات: ۱۰۴ قیمت: دو روپے

مفت تقسیم کے لیے بڑی تعداد میں خریدنے والوں کے لیے ۳۳ فی صد کمیشن۔ ایک نسخہ کے خواہش مند دو روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں۔

ادارۂ احتساب، امینی منزل

دودھ پور روڈ، علی گڑھ

المركز الاسلامی

AL-MARKAZ-UL-ISLAMI (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASIMJAN STREET - DELHI 110006 (India)

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی مہم کے بجائے اُخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک مہم ہے۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

ہمارا پروگرام

۱ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجرا، جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جا سکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے

خطوط وغیرہ پر حسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
Single Copy Rs. 2.00
OCTOBER 1 — 1977

AL-RISALA MONTHLY
JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India,

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے ۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر "الرسالہ" جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا